پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو
کشمیر یونیورسٹی
کا

ترجمان

ادبیات

(غالب نمبر)

مرتبہ
عبدالقادر سروری

— مطبوعہ —

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار مینار

حیدرآباد دکن ۲ (آ۔پی)

— ملنے کا پتہ —

- پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو ۔ کشمیر یونیورسٹی حضرت بل سرینگر (کشمیر)
- شیخ غلام محمد اینڈ سنز کتب فروش ۔ مائسومہ بازار سرینگر (کشمیر)
- نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان ۔ حیدرآباد دکن (اے ۔پی)
- کشمیر بک ڈپو ۔ ریذیڈنسی روڈ ۔ سرینگر (کشمیر)

مشتملات

ترتیب

غالب اپنے لازوال نغموں اور ان کی قومی اور عالمی اپیل کے باعث ہمارے قومی شاعروں میں ایک ممیز مقام حاصل کر چکے ہیں۔ پچھلے سال صد سالہ جشن کی تقریبوں کے سلسلے میں یہ مزید واضح ہوا کہ ان کی شاعری نہ صرف ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں میں مقبولیت رکھتی ہے، بلکہ ہندوستان سے باہر مختلف زبانوں کے نقادوں کی نظر میں بھی ان کے خیال اور شاعری کے روپ میں کچھ ایسی خصوصیات موجود ہیں، جو سنجیدہ مطالعے کا موضوع بن سکتی ہیں۔ چنانچہ پچھلے سال فروری میں، انگلستان، اٹلی، چیکوسلواکیہ، امریکا، روس، ایران، اور عرب کے سربرآوردہ ادیبوں اور نقادوں نے بین قومی سیمینار میں جو مقالے پیش کئے تھے، ان سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ غالب کے فکر و فن کے سمندر میں ابھی بہت سے در نایاب ہیں، جن تک ہندوستانی نقادوں کی نظر نہیں پہنچ سکی تھی، اور ان کا مطالعہ نہ صرف زبان اور اسلوب کے نقطہ نظر سے کیا جا سکتا ہے، بلکہ خیال اور تفکر کے اعتبار سے بھی انہیں بڑی گہرائی موجود ہے۔ مقالات کا مجموعہ، جو اس سیمینار میں پڑھے گئے تھے، جلد ہی چھپ کر منظر عام پر آ رہا ہے اور اس سے غالب کے ایسے طالب علم بھی استفادہ کر سکیں گے جنھیں سیمینار میں شرکت کا موقع نہیں ملا۔

اردو ادب کیلئے اس یادگار سال میں کئی مستقل تصانیف شائع ہوئیں، اور بہت سے ماہناموں کے غالب نمبر شائع ہوئے جنکی تفصیل یہاں دینے کا موقع نہیں۔ ان تصانیف اور رسالوں کے ذریعے سے بھی بہت سا نیا تحقیقی اور تنقیدی مواد ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ ہر تصنیف اور ہر رسالہ کوئی نہ کوئی خصوصیت رکھتا ہے، اور ان کا مطالعہ اردو ادب کے طالبعلموں کیلئے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ کشمیر نے بھی اپنی تہذیبی اور ادبی روایات کے شایان شان جشن غالب کی تقریبوں کا اہتمام کیا جنکی تفصیل آگے اوراق میں درج ہے۔ اس میں شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی نے اپنی بساط بھر حصہ لیا۔ یونیورسٹی نے ان تقریبوں کے انعقاد کیلئے دو ہزار کی رقم مہیا کی تھی، اور شعبہ اردو کے اہتمام سے جشن غالب کی مستقل یادگار کے طور پر، شعبہ کے ایک استاد ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی کاشمیری کی تصنیف "غالب کے تخلیقی سرچشمے" شائع کی گئی۔ شعبہ کے ترجمان "ادبیات" کا یہ غالب نمبر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس رسالے کے مقالوں اور مطالعوں کی صورت میں بھی کچھ نیا تخلیقی اور تنقیدی مواد اردو ادب کے طالبعلموں کے سامنے آ رہا ہے، اسی میں ایک اہم مسئلہ غالب کی والدہ کے کشمیری نژاد ہونے کے بارے میں بھی ہے۔ توقع ہے کہ اس مسئلے کی آئندہ زیادہ چھان بین کے مواقع پیدا ہوں گے۔

امید ہے کہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا یہ تحفہ نقادوں کی نظر میں مطالعے کے قابل ثابت ہوگا، اور اردو

عبدالقادر سروری

غالب اور نفس انسانی کا عرفان

غالب غزل گو شاعر تھے، اور غزل کے بنیادی موضوعات عشق و محبت کی واردات ہیں۔ اس میں سستی نفسی کیفیتیں بھی بیان کی گئی ہیں، لیکن غزل ہی کی صنف میں انسانی نفسیات کے گہرے راز بھی بیان ہوئے ہیں اور غزل میں اس کی وسیع گنجائش ہے۔ کچھ نقاد اگر غزل کی انفرادیت کو ناپسند کرتے ہیں اور اسکو نامطبوع صنف شاعری قرار دیتے ہیں، تو دراصل وہ غزل کی شاعری کے حسن اور اس کی روح کو سمجھنے سے قصور کا اعتراف کرتے ہیں، یا پھر اس میں دوسروں کے ذہن سے سوچنے کی عادت کا دخل ہوتا ہے۔ بعض وقت ایسے نقادوں کی اپنے ادب کے محرکات اور روایات کی قدریابی کی صلاحیت کے بارے میں شبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر قوم بلکہ ہر لسانی گروہ کا ادب، ہیئت اور مواد ہر اعتبار سے اپنی فکر کے مخصوص نہج اور اپنے جمالی شعور کا زائیدہ ہوتا ہے۔ انھیں محرکات کے اثر کے ماتحت شعر و ادب کے سانچے متشکل اور متعین ہوتے ہیں۔ روایت میں تبدیلی ادب کی تنقیص سے نہیں بلکہ فکر کی رہنمائی سے ہو سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ موجودہ زمانے میں دنیا ذہنی اعتبار سے سکڑ رہی ہے۔

اور تجارتی اور اقتصادی اثرات کے علاوہ افکار کے باہمی تبادلے کے ساتھ ساتھ، ادبی نہج اور معیار بھی ادل بدل ہو رہے ہیں. تاہم یورپ کی سیاسی، مادی اور فکری برتری کے باعث، پچھلی ڈیڑھ سو صدی میں مشرقی فکر اور ادب، یورپی ادب کو معیار کے طور پر اختیار کر کے، اس کا اتباع کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے. شاذ و نادر اس کے برعکس صورتیں بھی ملتی ہیں. مثال کے طور پر گوئٹے جیسے صاحبِ نظر مفکر اور ادیب کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے، جو مشرقی شاعری اور خاص طور پر غزل کے انداز سے متاثر ہوا تھا۔

اس لین دین کے باوجود یورپی ادب کے مشرقی اور ہندوستانی موضوعات، محرکات، اور روایات کو اپنانے کی بہت کم گنجائش ہے، بجز اس کے کہ مشرق کی سیاسی اور مادی برتری کے ساتھ ساتھ فکری برتری کے آثار بھی نمایاں ہونے لگیں، اور مغربی ذہن ہمارے ادبی معیاروں کو اپنانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود، معیاروں کے یکساں ہو جانے کے بہت کم امکانات ہیں. کیونکہ قوموں کی افتاد کی نمو کے لئے ادب میں ہمیشہ گنجائش باقی رہے گی. اور ہر قوم کا کلاسیکی ادب اپنی اہمیت کو برقرار رکھے گا.

غزل کی شاعری کا مخصوص نہج، اس کی فنی خصوصیات اور اس کے رجحانات جو ہماری شاعری کے لئے ایک حقیقت ہیں، کبھی یورپی فکر سے مرعوبیت کے باعث اور کبھی یورپی ادب کے انداز کو مکمل ذریعۂ اظہار مان لینے کے نتیجے کے طور پر، ہمارے بعض نقادوں کو ناپسند رہے ہیں، لیکن ان کی سخت سے سخت تنقید بھی، غزل کی مقبولیت کو نقصان نہ پہنچا سکی، بلکہ وہ ترقی ہی کرتی رہی ہے، اور اپنی سرحدوں کو

عبور کر کے، ذہنوں کو متاثر بھی کیا ہے۔ ہمارے غزل گو شعرا نے بدلتی ہوئی فکر اور نئے عہد کے فنی تقاضوں کو اپنے کلام میں سمو کر، یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ غزل کا فن جامد نہیں، بلکہ مذاق اور ذہن کی تبدیلی کے وہ بھی تابع ہے۔

غزل کی وہ خصوصیات جو اس کی حیات پائدار کی ضامن رہی ہیں، اس کی انسانی نفسیات کے توبرتو پردوں کو اٹھانے، اور شعور اور تحت شعور کی سرحدوں کا احاطہ کرنے اور کبھی کبھی لاشعور کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش ہے۔ یہ کوشش شاعر کی اپنی فکر کی گہرائیوں اور آگاہیوں کی وسعت کے لحاظ سے بڑا تنوع رکھتی ہے۔ ان شاعروں کا یہاں ذکر نہیں، جو دوسرے سخنوروں کے ذہن سے سوچنے کو اپنی فکر کا ماحصل سمجھتے ہیں، وہ غزل گو شاعر، جو ذاتی سوچ بچار کی صلاحیت رکھتے ہیں، انسانی عمل اور ذہن کی کارفرمائیوں کے ایسے گوشوں تک رسائی پا لیتے ہیں جو بعض صورتوں میں ہمارے لئے ایک نفسیاتی انکشاف ہوتا ہے۔ انھیں شعرا میں غالب کو بھی شمار کرنا چاہئے۔

غزل کا مرکزی موضوع عشق و محبت اور حسن ہے، اور اس کے باوجود کہ سالہاسال سے ہمارے شاعروں کی فکر اسی کے اردگرد گھومتی اور چکر کاٹتی رہی ہے، اس قصہ کہن میں تازگی اور بلا کی وسعت ہے۔ غزل کا عشق، انسان سے انسان کے عشق اور انسان کے فطرت سے عشق کا ترجمان ہے۔ جہاں عشق ماورا کا تذکرہ بھی ہوتا ہے، انھیں اصطلاحوں میں ہوتا ہے، اور ان ساری جہات اور کیفیات کی ترجمانی کے لئے ہماری شاعری نے اظہار کے ایسے حسین سانچے، اور پیچیدہ جذبات اور احساسات کو لفظوں میں قید کرنے کے لئے ایسے استعارے

اور کتنا ہے نشو و نما دے لئے ہیں کہ وہ اب ہماری ذہنی زندگی اور ادبی مذاق کا ایک جزبن گئے ہیں۔ لیکن غزل کی یہ آخری منزل بھی نہیں، اس کی خوب سے خوب تر کی تلاش برابر جاری ہے۔

غزل کا ایک تنہا شعر بعض وقت ایک مختصر قصہ اور کبھی کبھی ایک مجمل ڈراما ہوتا ہے، اور اس کے اپنے کردار، محبت کرنے والے اور محبت کے موضوع کے علاوہ رقیب روسیاہ، اور شاذ موقعوں پر ناصح مشفق اور واعظ ناداں بھی ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر عاشق، محبوب اور رقیب کے تکونی مرقع کے اندر، شاعروں نے نفس انسانی کی عجیب عجیب تصویریں بنائی ہیں۔ جہاں تک غالب کی شاعری تعلق ہے یہ کردار، روایتی ہوتے ہوئے بھی اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ محبوب، ہماری شاعری میں ستمگر ہے، لیکن غالب کا محبوب ستم ظریف ہے، اور اس کی خوئے ستم ظریفی کے جو خط و خال غالب کے یہاں ابھرے ہیں، اسے ایک انفرادیت بخش دیتے ہیں، اور وہ غالب ہی کا معشوق ہو سکتا ہے۔ غالب نے اس کی ستم ظریفی کے بہت سے پہلو پیش کئے ہیں اور کبھی خود بھی اسے ستم ظریف کہا ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
ہنس کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں؟

لیکن جہاں اسے ستم ظریف نہیں بھی کہتے، اس کا یہ کردار پورے طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس تصور کی حد تک بعض اور خصوصیات کی طرح، غالب کی شاعری میں یکسانیت ہے۔ محبوب کا یہ شیوہ بھی قابل دید ہے کہ عاشق اس کو

اپنا حال دل سنانے کے مواقع ڈھونڈتا رہتا ہے، اور وہ پہلو تہی کرجاتا ہے۔ اثر کرے نہ کرے، وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ محبوب اس کی فریاد سن لے۔ محبوب یہ سب جانتا ہے، اور یہ بھی چاہتا ہے کہ عاشق کو ابدی شکایت نہ رہ جائے۔ وہ پرسش احوال کرتا ہے۔ لیکن کہاں؟ بازار میں، جہاں غالب جیسا خوددار عاشق تو کیا، بوالہوس کو بھی کچھ کہتے ہچکچاہٹ ہوگی۔ اور محبوب یہ شعوری طور پر کرتا ہے اور اس کا جو ردعمل ہوسکتا ہے، اس سے ظاہر ہے، اسے لطف بھی آتا ہے۔ شعر ہے:۔

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال
کہ یہ کہے کہ سر رہ گذر ہے، کیا کہیے

جو واردات کہ خلوت میں بھی مشکل سے کہی جاسکتی ہے، ظاہر ہے کہ بازار میں کیسے بیان کی جائے گی؛ غالب کے بہت سے شعروں کی طرح اس شعر میں بھی تصویر کا پس منظر بہت پھیلا ہوا ہے۔ محبوب بھی نفس شناس ہے، وہ جانتا ہے عاشق کو اس کی بے توجہی کا گلہ ہے، اور اس کی نفس شناسی سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ، شکایت کا انداز اس کے لئے پریشان کن ہوگا۔ موقع دے کر بھی موقع نہ دینے کا یہ بلیغ انداز، غالب کا محبوب ہی اختیار کرسکتا ہے۔ یا پھر وہ ایک اور ستم ظریفی کا شیوہ یہ اختیار کرتا ہے کہ گلہ سنانے کے لئے وقت مقرر کرتا ہے، اور جب عاشق آمادہ ہوکر آتا ہے، تو دیکھتا ہے کہ وہاں رقیبوں کا ایک ہجوم ہے۔ دبی زبان سے یہ گلہ کرکے خاموش ہوجاتا ہے:

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو　　　اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

اس حسن گریز پا یا کو قایل کرنے کی ایک ترکیب غالب کو یہ سوجھتی ہے کہ، لیلیٰ و مجنوں کے عشق کا افسانہ اسے سنائے، اور اس میں خاص طور پر اس واقعے کو نمایاں کرے کہ لیلیٰ کبھی کبھی جوش وحشت میں دشت نجد پہنچ جایا کرتی تھی۔ محبوب ذہانت میں اسے یہاں بھی مات دیتا ہے:

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا
وہ بولے کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں!

اس "کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں" کی بلاغت کے حسین پہلوؤں میں ایک تو عاشق کی حوصلہ فرسائی کا مقصد ہے ہی، لیکن اس کا دوسرا پہلو، محبوب کا لیلیٰ پر برتری کا احساس بھی ہے۔ یہی احساس ایک دفعہ اس کے محبوب کو غیر شعوری طور پر یوسف کہہ دینے ابھرتا ابھرتا رہ گیا:

یوسف اس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

مثالوں کے یہاں پرے جمانے کی ضرورت نہیں، یہ چند مرقعے بات کو واضح کرنے کے لئے کچھ کم نہیں ہیں۔

رقیب ایک جنس نامطبوع ہے، فطرتاً اور کسی حد تک روایتاً۔ وہ بوالہوس ہے، ناموس وفا کا اسے پاس نہیں، لیکن غالب کی شاعری میں وہ مجہول ہی رہا اور طرح طرح کی تنازاس پر پڑتی رہی۔ غالب نے اس کی بے تہ خودنمائی کی جیتی تصویریں شوخ رنگوں میں کھینچی ہیں، وہ ایک ہلکی فطرت والے انسان کی نفس کے چوروں کو بڑی خوبی سے پیش کرتی ہیں۔ محبوب نے اسے خط لکھا ہے، اور وہ خط کا کاغذ لئے

بازاروں میں اتراتا پھر رہا ہے، بات اسی حد تک رہتی بھی تو کوئی ہرج نہیں تھا، خط کو لئے پھرنے کا انداز کچھ اس طرح کا تھا کہ، لوگوں کی نظریں خواہ مخواہ کاغذ پر پڑتیں۔ اس ترغیب دینے والے انداز پر لوگ اس سے خط کے بارے میں دریافت کریں تو وہ دکھانے کی خاطر اسے چھپانے کا بہانہ کرے۔ اس قلمی اور لفظی تصویر میں جو نفسیاتی مرقع پیش نظر ہوتا ہے، وہ موقلم کی تصویر میں سما نہیں سکتا:

غیر پھرتا ہے، لئے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

یہ ہلکی فطرت انسانوں کی بڑی عریاں تصویر ہے، اور اس میں ایک ضمنی پہلو محبوب کی اہمیت ذات کا بھی ہے، اس کا خط وہی اہمیت رکھتا ہے، جو کسی عظیم شخصیت کے خط کی ہوتی ہے۔ شعر میں لطیف مزاح، غالب کی فکر کی خصوصیت ہے۔

اس تصویر کے مقابلے میں، رقیب کی ایک تصویر یہ بھی ہے کہ وہ نالہ کر رہا ہے، ساتھ ہی خدا سے اس کی بھی دعا کر رہا ہے کہ اس کے نالوں میں اثر دے۔ اس سے عاشق کے جذبہ رشک کی کچھ تسکین ہو جاتی ہے، کہ وہ اس سے زیادہ کامیاب نہیں۔ شعر ہے:۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا

نالہ کرتا تھا، ولے طالب تاثیر بھی تھا

انسانی نفس اور اس کے شعور اور لاشعور کی کچھ نہیں، ان موقعوں پر بھی وا ہوئی ہیں، جب غالب رشک کے نازک شاخوں کو ابھارتے ہیں۔ بعض

اشعار میں رشک کے تعلق سے انسان کے تحت شعور اور شاید لاشعور کے جو راز منکشف ہوئے ہیں، وہ اہل نفسیات کے غور کے بھی محتاج ہیں۔ مثلاً محبوب کو دیکھنے کی آرزو میں مرنے والا جب یہ کہتا ہے۔

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے مجھ سے

اس میں محبوبیت کی عفت کے مجروح ہونے کا ڈر ہے، یا ماورائی محبت کا شائبہ ہے، غرض کافی پیچیدہ کیفیت ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر بعض نازک نفسیاتی لمحات کو غالب کے شعور نے محسوس کیا، اور ان کی قوت گفتار نے اسے گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں:۔

نفرت کا گماں گذرے ہے، میں رشک سے گذرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

اس جذبے کے کچھ اور پہلوؤں کی پیش کشی بھی افراط و تفریط کی نفسی گتھیوں پر بڑی خوشگوار روشنی ڈالتی ہے۔ عاشق، محبوب کے گھر کی تلاش میں چلا ہے، گھر کا پتہ معلوم نہیں، رشک اس کی اجازت نہیں دیتا کہ گھر کا نام لے، اور ہر راہ گیر سے استفسار کر رہے ہیں کہ میں کہاں جاؤں!

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

نصب العینی تصور محبوبیت کا یہ پاس، بعد مرگ بھی تقدس رکھتا ہے، چنانچہ غالب کہتے ہیں:۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھکو بعد مرگ　　میرے پتے سے غیر کو کیوں تیرا گھر ملے

غالب اپنی نامرادیوں کا ہمیشہ ماتم کرتے رہے۔ ممکن ہے کہ ان کے ہم چشموں میں کئی ایسے بھی ہوں، جو ان کے سے خوش حال بھی نہیں تھے، لیکن غالب کو قسام ازل سے، اپنے درخور حوصلہ نہ ملنے کی شکایت تھی۔ ذوق، جن کو انہوں کبھی اپنا مد مقابل نہ مانا، شہ کے مصاحب بنے اتراتے پھرتے تھے۔ اُن کا انداز شعر گوئی عوام میں مقبول تھا، اور قلعے کے شاعروں میں ان کی شاعری کی دھوم تھی اور اِن کی اپج پر بعض وقت خواص بھی ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ یہ نئے مذاق کے بانی تھے، زبان اور محاورے کی رعایتوں پر شعر کہنا انھیں ناگوار تھا، جس کا چسکا عوام اور خواص کو لگ چکا تھا۔ اردو کی طرح فارسی میں بھی غالب کو اپنے انداز اور اپنی زبان پر ناز تھا، لیکن میرزا قتیل اور ان کے بہت سے ہوا خواہوں نے، ان کی شہرت پر بڑی سخت ضرب لگائی تھی، اور ہرمزد عبد الصمد کا فرضی یا واقعی واسطہ لینے سے بھی کچھ بات بنتی نہیں دکھائی دی۔

مایوس تمنا انسانوں میں عافیت بیزاری کا جو جذبۂ پیہم ناکامیوں کے باعث ابھرنے لگتا ہے، اس کا بیان، غالب کے اپنے ہی جذبات اور احساسات کا بیان تھا۔ انسانی نفسیات کے اس مخصوص رجحان کے گوناگوں پہلو غالب کے موضوع رہے ہیں۔ اور ان میں خود ان کی نفسیاتی افتاد کے تیور نمایاں ہیں۔ ناکامیوں کا شدید احساس حسّاس ذہنوں کو بغاوت کی راہیں سمجھاتا ہے۔ چنانچہ ذیل کے اشعار انھیں نفسی گتھیوں کی نمایندگی کرتے ہیں:۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

غالب کا ذہن سمجھوتوں کا عادی نہیں تھا، اور قول اور فعل کی طرح ذہنی منافقت بھی انھیں ناپسند تھی وہ دو ٹوک طرزِ عمل اختیار کرنا بھلا جانتے تھے۔ اگر انھیں زہد و تقویٰ میں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا، تو پھر ان کے لئے بیچ کا کوئی راستہ نہیں تھا، رندی ہی سے، ان کے جذبۂ انتقام کی تسکین ہو سکتی تھی۔ کہتے ہیں:۔

دل گذرگاہ خیال مئے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادہ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

اس طرح جب تمنائیں پوری نہ ہوں، تو بارگاہ ایزدی سے مایوسی کے جذبات کی نفی اور اپنے احساسات کو تسکین دینے کی ایک صورت ہے، اور وہ ایسی چیز کی خواہش ہے، جو حاصل ہے۔ شعر ہے:۔

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز　　دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

لیکن اس انوکھی دعا میں جو طنز ہے، وہ خود جذبات عقیدت کی نفی ہے۔
عشق و محبت کے جذبے کی بے اختیاری، شاعری کا ایک موضوع رہی ہے میر نے اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا تھا:۔

کاہے کو کوئی خراب خواری ہوتا　　کاہے کو ہمیں یہ جان بھاری ہوتا
دلخواہ ملاپ ہوتا تو، تو ملتے　　اے کاش کہ عشق اختیاری ہوتا

غالب اس جذبۂ بے اختیاری کی کیفیت کو ایک شخصی تجربہ بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

دلے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

غالب کا یہ بھی تجربہ تھا کہ عشق زندگی کا ماحصل اور اس کا ست ہے۔ بے عشق زندگی، کسی آدرش کے ساتھ والہانہ وابستگی کے بغیر زندگی بے مزہ زندگی ہے غالب کے بیان کا ماورائی انداز، اسے ایک ازلی درد اور ایک روحانی طلب کی اصطلاحوں میں پیش کرتا ہے:۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

عشق خانہ ویراں ساز بھی ہے، رونق زندگی بھی۔ اس تضاد کو، تضاد کی شکل میں کنائے سے کتنا بلیغ بنا دیا ہے:۔

رونق ہستی ہے، عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

جب فطرت انسانی کی یہ کیفیت ہے کہ 'بے عشق زندگی' دوبھر ہو جاتی، اور ایک کرب مسلسل بن جاتی ہے، تو اس کا چسکا، جسے ایک مرتبہ لگ چکا ہو، وہ پھر بے عشق کیسے گذار سکتا ہے۔ اس حقیقت کو بھی ایک شخصی تجربے کی صورت میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

عشق و محبت کی ناگزیری، غالب کی فکر میں تسلسل قائم رکھتی ہے۔ ایک شعر میں، وہ کہتے ہیں کہ عشق کی کٹھن راہوں سے گذرنے کی متحمل زندگی نہیں ہو سکتی:

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے، اور یاں طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

پرامید رہنا اور مسلسل تذبذب، نفس انسانی کے دو پہلو ہیں، ایک کا نتیجہ خطرہ میں کود پڑنے کی ہمت اور دوسرے کی فیصلہ نہ کر سکنے اور ذہنی کش میں مبتلا رہنے کی عادت ہے۔ ایک شاعر ان دونوں نفسی کیفیتوں کو ایک شعر میں اس طرح پیش کیا ہے:

جو ہچکچا کے رہ گیا وہ رہ گیا ادھر
جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

ایک اور شاعر نے اس مضمون کو زیادہ لطافت سے پیش کیا ہے:۔

"اٹھا لے جو بڑھا کر ہاتھ" یاں مینا اسی کا ہے

غالبؔ نے فطرت انسانی میں اس کش مکش کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح دکھایا ہے:۔

یاس و امید نے اک عربدہ میدان مانگا
عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

کچھ حقایق نفس الامری کو بیان کرتے ہوئے غالبؔ نے نفس انسان کی بعض پیچیدہ گتھیوں کو پیش منظر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ بعض فطرتیں پس افتادگی اور تسلیم و رضا میں آسایش تلاش کرتی ہیں۔ یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ گاڑی کے بیل، شیر یا چیتے کی بو پا کر جنگل میں سر زمین پر رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس افتاد فطرت کو غالب بیان کرتے ہیں:

شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا ہوں گردن کو

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصائب کا تسلسل، انسان کو ان کا خوگر بنا دیتا اور اس کی فطرت میں برداشت کی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ غالب کا یہ شعر اسی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے :۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پہ پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

انسان بعض وقت، وہ جتنی صلاحیتوں کا مالک ہے، ان سے بڑھ چڑھ کر اپنے آپ کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے، جس کا خمیازہ، سماج میں اس کی قدر کا گھٹنا ہے۔ غالب کہتے ہیں :

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ بڑھ گئے، اتنے ہی کم ہوئے

اسی حقیقت کو ایک اور پہلو سے اس طرح بیان کیا ہے :۔

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں   سخت ارزاں ہے گرانی میری

غالب کے عرفان نفس انسانی کے یہ چند پہلو ہیں، اور ان کی شاعرانہ عظمت میں، اور خصوصیات کے علاوہ، ان کو بڑا دخل ہے۔

ڈاکٹر میاں غلام مصطفےٰ

غالبؔ اور انگریز

گذشتہ صدی کے وسط میں انگریزوں کے خلاف آزادی خواہوں کی آخری متحدہ کوششوں کی ناکامی اور انگریزی حکومت کے استحکام نے ملک میں نئے حالات پیدا کردیے تھے۔ بہادر شاہ مجاہدین آزادی کے سربراہ تھے، اور لال قلعہ ان کی جدوجہد کا مرکز بنا تھا۔ اس لئے انگریز ایسی ہر چیز سے جو اس حلقے سے تعلق رکھتی تھی، مشتبہ تھے، اور اس کے قلع قمع کے درپے۔ غالب کا تعلق آخری زمانے میں قلعہ سے ہو گیا تھا، اس لئے ان پر بھی زد پڑی تھی۔ اس سے بچنے کے انھیں جتن کرتے تھے۔ اسکے علاوہ وہ انگریزوں کے پنشن خوار بھی بن گئے تھے، اس لئے انھیں بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی تھی۔ کچھ انگریزوں کی صلاحیتوں کے حقیقی قدردان بھی تھے۔ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اور اپنے عہد کے تقاضا کے مطابق وہ "گورنر جنرل" بننے کے بھی آرزومند تھے۔ جنگ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریز اپنے ازلی بہی خواہوں پر جو شبہ کرنے لگے تھے اسی سلسلے میں مرزا غالب پر بھی الزام تراشنے کے اسباب ڈھونڈے گئے تھے چنانچہ ایک بھاری الزام ان پر قلعے سے تعلق اور بہادر شاہ ظفر کے خیر خواہ ہونے کا یہ تھا کہ انھوں نے بہادر شاہ کے نام کا "سکہ" کہا تھا۔ باغیوں کے سربراہ کی حیثیت

سے بہادر شاہ اور ان کے متوسلین سارے عتاب میں آ گئے تھے۔ غالب کو جب اس بات کی سنگینی کا احساس ہوا تو، وہ کافی پریشان رہے۔ بھائی یوسف مرزا کو ایک خط میں لکھا تھا۔

"میں نے سکّہ کہا نہیں، اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا اور یہ گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔"

اس مسئلے پر کافی بحث ہو چکی ہے کہ سکّہ غالب نے کہا تھا یا نہیں، اس لئے اب اس پر مزید گفتگو تحصیل حاصل ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور کہنی ہے کہ غالب نے سکہ کہا ہو یا نہ ہو، لیکن مضمون شعر اور اس کا انداز ہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ مرزا کا ہے، اور یوسف مرزا کے موسومہ خط سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ رسالہ معارف میں اس سلسلے میں کئی مضمون نکل چکے ہیں۔ شعر یہ ہے:

بر خدا آفتاب و نقرہ ماہ   سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

مرزا نے اس سلسلے میں حکومت کے معتمد سے مل کر معاملہ کی صفائی کرنی چاہی تھی۔ اس کا جو حشر ہوا اس بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میر منشی سے ملا، ان کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر صاحب بہادر کو اطلاع کرا دی۔ چپراسی کے ساتھ کلّو بھی گیا تھا جواب آیا کہ یہاں سلام دو اور کہو فرصت نہیں۔ خیر میں

گھر آیا۔ کل بھی گیا خبر کروائی۔ حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم

باغیوں کی خوشامد کرتے رہے' اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو۔

عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا"

اسی سلسلے میں عبدالغفور سرور کو لکھا تھا:۔

" سکہ کا وار مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا گرا۔ اب کس سے کہوں'

کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں'

یعنے جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھا تو ذوق نے سکّے کہہ کر گذارے"

مگر رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ حالات بھی کچھ سازگار ہوتے گئے۔ مرزا نے صفائی کی کوشش جاری رکھی چنانچہ ایک خط میں ان کوششوں کا ماحصل لکھتے ہیں۔

" میر منشی صاحب سے ملا۔ ان کے خیمہ میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب

سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب دیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہ

باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے' اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔

میں گدائے مبرم اس حکم پر مایوس نہ ہوا' جب لاٹ صاحب بہادر

کلکتہ پہنچے میں نے قصیدہ حسب معمول قدیم بھیجدیا' مع اس حکم کے

واپس آیا کہ یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوس مطلق ہو کر

آیا اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا"

" ماہ گذشتہ یعنی فروری ۱۸۶۲ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلی آئے

اہل شہر صاحب ڈپٹی کمشنر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانہ

محض اور مفرور حکام تھا جگہ سے نہ ہلا' کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کام گار ہوا۔

شنبہ ۸ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے کمرہ میں چلا گیا۔
اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا بلایا گیا۔ مہربانی پاکر نواب
صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ دو حاکم جلیل القدر کی
وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں نہ تھیں۔ جملۂ معترضہ میر منشی لفٹنٹ
گورنر سے سابقۂ تعارف نہ تھا وہ بطریق حسن طلب میرے خواہاں ہوئے
تو میں گیا۔ جب حکام بمجرد استدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس
کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی حسن طلب بہ ایمائے حکام ہوگی۔ وللہ الحمد الطاف
خفیہ۔ بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سوار شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔
آخر روز اپنے شفیق قدیم اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو
میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے
پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے اگر تمہارے
علاقے کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ
اسد اللہ خاں کا دربار اور خلعت بدستور اور برقرار ہے۔ میں نے پوچھا کہ
حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا۔ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا
جانتے ہیں کہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۱۴ دن ۱۵ دن بعد ادہر کو روانہ ہوئے
میں نے کہا تعالیٰ اللہ۔

کارساز ما بفکر کار ما   فکر ما در کار ما آزار ما

" سہ شنبہ ۲۲ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے
مجھکو بلایا خلعت عطا کیا اور فرمایا لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا

دربار اور خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا حضور کے قدم دیکھیے، خلعت پایا، لاٹ صاحب کا حکم سن لیا نہال ہو گیا۔ اب انبالہ کیا جاؤں، جیتا رہا تو دربار میں کامیاب ہموارہ ہوں گا؟

اوپر کا خط غلام غوث خاں بے خبر کے نام ہے، ذیل کا اقتباس بھی انھیں کے موسومہ ایک خط کا ہے، جس میں ولایت سے وزیر اعظم کا خط آنیکا حال لکھا ہے۔

"۱۸ دسمبر کا لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے قصیدہ کا صلہ اور جائزہ کے واسطے جو بتوسط لارڈ الن برا سائل نے بھجوایا ہے خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے، جو حکم صادر ہوگا سایل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔"

ایام غدر میں مرزا پر کافی سختی کی گئی۔ جس کا اندازہ ان کے خطوط کے ذیل کے اقتباسات سے ہوتا ہے:۔

"تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں رہنا بے اجازت سرکار نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ نہیں۔ پھر میں کیا کروں، کیوں کر وہاں آؤں۔"

"ڈپٹی کمشنر نے بلا بھیجا تھا، صرف اتنا پوچھا کہ غدر میں تم کہاں تھے۔ جو مناسب تھا وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدہ ولایت بھی پڑھائے۔"

"خط نواب گورنر جنرل بہادر کے چیف سکرٹر کا ہے، ترجمہ اس کا یہ ہے۔ از دفتر سکرٹر اعظم، حکم دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو جواب اس عرضی کا نواب گورنر جنرل بہادر بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔"

لیکن ہنگامی حالات کے گذرنے کے بعد انگریز حکام نے، غالب کی فکری اور قلمی قابلیت کا اندازہ کرتے یقیناً یہ محسوس کیا کہ ان سے بگاڑنا بھی ٹھیک نہیں۔ انگریز ایک باشعور قوم ہے، انگریز حکام کو اس کا احساس ہوا ہوگا کہ شاعر کا قلم ان کی حکومت کے بارے میں جو لکھ دے گا وہ تاریخ میں یادگار رہ جائے گا، اس لئے، غدر سے پہلے ان کے ساتھ جو مراعات ملحوظ رکھی جاتی تھیں، وہ بحال ہو گئیں۔ ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:۔

"حقیقت میری عملاً یہ ہے کہ راہ و رسم میری حکام عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخہ دستنبو بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا، ان کا خط فارسی متضمن تحسین عبارت قبول صدق ارادت بہ سبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تشبیب اور مدحت میں بھیجا گیا۔ اس کی رسید آ گئی مشتمل بر مہربان دوستانہ القاب اور کاغذ افشانی ازاں بعد ایک قصیدہ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی خدمت میں بتوسط صاحب کمشنر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر کل آگیا"۔

منشی عبدالغفور سرور کو اس کی مزید تفصیل لکھی ہے:۔

"گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ میری طرف سے قصیدہ نذرانہ گذرتا ہے۔ اشرفیاں خلعت ریاست دو دمانی کا سات پارچہ اور رقم جیغہ سرپیچ مالائے مروارید مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل بہادر

یہاں آتے ہیں۔ دربار میں بلائے جانے کا طامع نہیں"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:۔

"صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی سانڈرس بہادر نے مجھ کو بلایا۔ ۲۴۔ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہونے کو تھے۔ میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵۔ فروری کو میں گیا، ملاقات ہوئی، کرسی دی، بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا پھاڑ کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط میکلوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر اکر لکھو۔ ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو"۔

غالب کے فارسی قصاید دیکھنے سے شیخ محمد اکرام کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ انھوں نے جس قابل ذکر انگریز سے ان کی راہ ورسم ہو گئی، اس کی مدح میں قصیدہ کہنے، منشی شیو نرائن کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں نے ایک قصیدہ اپنے محسن و مربی قدیم جناب فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب وشمال کی مدح میں ایک قصیدہ جناب منٹگمری لفٹنٹ گورنر بہادر ملک پنجاب کی تعریف میں لکھا ہے"

"دوشنبہ دن، پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت خیر خواہان انگریز اپنے اپنے گھروں میں روشنی کریں اور بازار میں صاحب کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی ہوگی، فقیر بھی اس تہیہ ستی میں کہ ۱۰ مہینے سے پنشن مقرر کا نہیں پاتا اپنے مکان پر روشنی کر چکا اور قطعہ

۱۵ بیت کا لکھ کر صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔ آپ کے پاس اس کی
نقل بھیجتا ہوں۔ اگر تمہارا جی چاہے تو اس کو چھاپ دو اور جس نمبر
میں چھاپا جاوے میرے دیکھنے کو بھیج دینا۔

دریں روزگار ہمایوں فرخ — کہ گوئی بود روزگار چراغاں
شدہ گوش پر نور چوں چشم بینا — ز آوازۂ اشتہار چراغاں

ایک خط میں نواب سعد اللہ خاں کو لکھتے ہیں کہ گورنر جنرل لارڈ لنک کو
ملکہ معظمہ کی طرف سے اعزاز عطا ہوا تو اس کی مبارک باد میں ایک قصیدہ لکھ کر
بھیجا تھا۔ خط کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"نواب گورنر جنرل بہادر لارڈ لنک کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزند
ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم
کیا۔ میں قصیدہ پہلے ہی اس تہنیت میں لکھ چکا ہوں"۔

منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں کہ میں نے ملکہ معظمہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کر
انگلستان بھیجا ہے۔ خط کا اقتباس ہے:۔

"میں نے ایک قصیدہ ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے۔
۶۰ شعر ہیں ۵ صفحے یعنے تین ورق پر چھپ کر دستنبو سے پہلے شیرازہ
میں شامل کر دئے جائیں"۔

ایک اور خط میں حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:۔

"جب کوئی نواب گورنر جنرل آتے ہیں تو میری طرف سے ایک قصیدہ بطریق
نذر جاتا ہے، بذریعہ صاحب ایجوٹنٹ بہادر دہلی اور نواب لفٹنٹ

گورنر بہادر آگرہ بھجواتا ہوں اور سکرٹر کا خط اس کی رسید میں بہ سبیل ڈاک پاتا ہوں"۔

انگریز عہدہ داروں اور ملکہ معظمہ کی مدح میں لکھے ہوئے سارے قصیدے ان کے کلیات فارسی میں شامل ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ یہ قصیدے کلاسیکی فارسی قصیدہ گوئی کے نفیس نمونے ہیں، ان قصاید کے مطالعے سے ممدوحین کی رسم مدح کی نگہداشت کے علاوہ، ان میں سے بعض قصیدوں سے، اس عہد کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے، جو انگریزی حکومت کے استحکام کا نتیجہ تھا۔ غالب کے فارسی قصاید کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے بڑی مفید معلومات کو سامنے لانے کا باعث ہوگا۔ غدر کے بعد انگریزوں کا استبداد غالب کو ان کی مدح سرائی پر مجبور کرتا تھا، کیونکہ یہ رویہ شریف شہریوں کے لئے ضروری تھا۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ بعض انگریز عہدہ دار غالب کے واقعی قدردان تھے، اور ان کی مدح سرائی غالب دل کھولکر کرتے تھے، ان کے علاوہ باقی قصیدے، رفع ضرر کا وسیلہ بنائے گئے تھے۔

غالب کے چہیتے شاگرد میر مہدی مجروح نے ان کی ایک غزل کی زمین میں بہ تغیر ردیف غزل کہی تھی، جس کا مطلع اور مقطع ہے:

جفا عادت کہاں تھی آسماں کی　　　　مگر تقلید اس نامہرباں کی

بہ تغیر ردیف اب کی غزل میں　　　　روش پر غالب معجز بیاں کی

ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت
شعبہ فارسی کشمیر یونیورسٹی

بزم غالبؔ

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں اساتذہ اکثر شعبہ فارسی میں دوسرے تیسرے دن مل بیٹھتے اور غالبیات پر دلچسپ اور بعض اوقات غیر ضروری بحث کیا کرتے رہتے تھے۔ طرح طرح کی خیال آرائیاں ہوتی تھیں اور معمول یہ تھا کہ غالب کا کوئی فارسی یا اردو کا پیچیدہ شعر منتخب کیا جاتا اور اس پر اساتذہ اپنی اپنی دانست کے مطابق اظہار خیال کرتے۔ یہ مباحثے بسا اوقات ایک ایک یا دو دو ہفتوں تک جاری رہتے، الفاظ اور ترکیبات پر غور ہوتا، فارسی کے قدیم استادوں کے کلام سے شواہد پیش کئے جاتے، خود مرزا کے کلام میں متوازی خیال کی تلاش کی جاتی اور موضوع کے ہر پہلو پر دلچسپ رائے کا اظہار ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ غالب کا یہ شعر کئی دن تک ہمارے ذہنوں کو پریشان کرتا رہا اور غالباً ابھی بھی کچھ ایسے دوست ہیں جو اس کے چند توضیحاتی نکات سے متفق نہیں اور شاید آیندہ بھی مطمئن نہیں ہو سکیں گے:۔

در بزم می بہ جام زمرد نخوردہ ای   سنجد بہ دشت جلوۂ داغ پلنگ را

چنانچہ اس شعر میں داغ پلنگ اور جام زمرد کے درمیان کیا تعلق ہوسکتا ہے، یہ بات عرصہ تک ہم سمجھ نہ سکے۔ بالآخر اتفاق سے میں ایران کی وزارت تعلیم و ہنر کے ایک مصور رسالہ "ہنر و مردم" کے اوراق پلٹ رہا تھا کہ مجھے علی عباس حسینی کی بنائی ہوئی ایک تصویر نظر آئی یہ رنگین تھی اور اس میں ایک ترک بچہ ساقی گری کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں زمرد کا جام تھا جس کی بیرونی سطح پر بعینہ ایسے ہی داغ نقش کئے گئے تھے جیسے کہ چیتے کی کھال پر ہوتے ہیں۔

بہر حال ایسی ہی ایک مجلس میں میں نے غالب کی ایک فارسی غزل پیش کی اور اس کی خوبیوں پر دوستوں کی رائے معلوم کرنے کے علاوہ اس امر سے دلچسپی ظاہر کی کہ ان کی نظر میں اس غزل میں مرزا کا روئے سخن کسی طرف رہا ہے۔ چنانچہ کم از کم تین رائیں پیش کی گئیں۔ اول یہ کہ خطاب معشوق کی طرف ہے۔ دوم یہ کہ خدا کی طرف اور سوم میری رائے جو ان دونوں رایوں سے الگ تھی اور جس کا مفصل ذکر سطور ذیل میں کیا جائے گا۔ قبل ازیں کہ میں اپنی رائے کا اظہار کروں لازم ہے کہ اس غزل کو عیناً نقل کیا جائے تاکہ قارئین کے لئے مزید دلچسپی کا باعث بنے۔

حق تا کہ حق است سمیع است فلانی بشنو — بشنوی گر تو خداوند جہانی بشنو

لن ترانی بجواب ارنی چند و چرا — من نہ اینم بشناس و تو نہ آنی بشنو

سوی خود خوان و بخلوت گہ خاصم جا دہ — آنچہ دانی بشمار و آنچہ ندانی بشنو

پردۂ چند بآہنگ نکیسا بسرائی — غزلی چند با ہنگ فغانی بشنو

لختی آئینہ برابر بنہ وصورت بنگر — پارۂ گوشش بمن دار و معانی بشنو
ہرچہ سنجم بتو از اندیشۂ پیری بپذیر — ہرچہ گویم بتو از عیش جوانی بشنو
داستان من و بیداری شبہائی فراق — تا نہ خسپی و بہ پاسخ نہ نشانی بشنو
چارہ جو نیستم و نیز فضولی نکنم — من و اندوہ تو چنداں کہ تو دانی بشنو
اینکہ دیدی نہ جبیم طلب زخم خطاست — سخنی چند نہ غمہائی نہانی بشنو

نامہ در بندیہ رہ بود کہ غالب جاں داد
ورق از ہم در و ایں مژدہ زبانی بشنو

کلیات نثر غالب (فارسی) میں مرزا غالب نے ایک دوست کے نام خط میں لکھا ہے کہ وہ اس غزل کو نمونہ کلام اور اپنے احوال کی شرح کے طور پر اسے بھیج رہے ہیں۔ دونوں باتیں قابل غور ہیں اول یہ کہ غالب نے خود اس غزل کا انتخاب کر کے اس کو نمونہ کلام کہا ہے اور دوم یہ کہ اس کے قلبی حالات اور قلبی کیفیات کی عکاسی ان اشعار میں ہوتی ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ غزل کا روئے سخن نہ تو معشوق ہی کی طرف ہے اور نہ خدا کی طرف۔ اس رائے کی صحت میں ہم ان دلائل کو پیش کریں گے جو تجزیہ کے بعد ہمیں حاصل ہوں گی۔

اس غزل میں کل دس اشعار ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام اشعار معنوی لحاظ سے ایک دوسرے سے مربوط ہی نہیں بلکہ مسلسل ایک ڈرامائی کیفیت کو پیش کرتے ہیں جو شاعر کے ذہن میں کسی خاص واقعہ کے نتیجہ کے تحت نمودار ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک مخصوص قلبی واردات کا آغاز مطلع کے ساتھ ہوتا جا رہا ہے جو

رفتہ رفتہ اپنی شدت کو پہنچ جاتا ہے اور پانچواں شعر جو یوں بھی غزل کی وسط اور اوج پر ہے، اس شدت کو کاملاً عیاں کرتا ہے۔ اس کے بعد شکست احساس کی حالت پیدا ہوتی ہے اور یہ حالت مقطع میں اسی طرح اپنی شدت کی پستی تک پہنچتی ہے جس طرح پانچویں شعر میں اپنی اوج تک۔

سب سے پہلے غزل کا مطلع لیجئے۔ اس میں "فلانی" کسی بھی حالت میں خدا کے لئے استعمال نہیں ہوا ہے اور اس کی تصدیق دوسرے مصرعے کے "خداوند جہانی" سے ہوتی ہے۔ یہاں "خداوند" کے بالکل وہی معنی ہیں جو پہلوی اور اوستا زبان میں ہیں "خوتای + بند" بمعنی مالک ملک۔ فارسی شعراء کے کلام میں اکثر خداوند اور خدایگان کو ایک ہی معنی کے لئے لایا گیا ہے اور بعض اوقات خداوندگار بھی اسی زمرہ کا کلمہ ہے۔ آج بھی ایران میں شاہنشاہ کو سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے "خداوندا" سے خطاب کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ "فلانی" پادشاہ سے خطاب کا موزوں اور باادب کلمہ نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول غزل کے مزاج اور شاعر کے تیور کو اچھی طرح سمجھا جائے تب جا کر اس اعتراض کی طرف اگر باقی رہے توجہ دی جائے۔ پس غالب خدا سے نہیں بلکہ ایک ایسے شخص سے مخاطب ہوا ہے جو خداوند جہاں ہے اور جس کو بچار ناچار حق کی بات سننی ہوگی کیوں کہ خدا بھی حق کی بات سن لیتا ہے تو وہ کیوں نہ سنے گا اگرچہ وہ مالک ملک ہی کیوں نہ ہو۔ مطلع سے مرزا غالب کے اس احساس کو سمجھنے میں چنداں دقت نہیں ہونی چاہئے

جو پوری غزل کا محرک ہے۔ اور اس کی طرف دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں اشارہ ملتا ہے۔ یعنی غالب اپنی تحکمانہ شخصیت کو سامنے لاتا ہے اور طرف مخاطب کو' اس زعم سے نکالتا ہے جو اسے اپنی شخصیت کے بارے میں ہوا ہے۔ تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں اس انداز گفتار کا اعادہ ہوا ہے چوتھا اور پانچواں شعر دونوں مخاطب کی شخصیت کو منہدم کرکے متکلم کو نہایت آہستگی کے ساتھ توازن کیطرف کشش کرتے ہیں۔ جیسے کہ قبلاً بتایا گیا پانچواں شعر واردات کے دو پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے یعنی ایک طرف غالب کی شخصیت کو ڈھارہا ہے اور دوسری طرف اس کے اپنے ذہن میں کسی کی دل شکنی سے پیدا ہونے والی رقت کی حالت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اگلے اشعار میں اخرالذکر حالت یا کیفیت' تقدم حاصل کرتی ہے اور یہ جذبہ اپنی شدت کو پہنچ جاتا ہے۔ غالب اپنے کہے پر اپنے سے رنجیدہ خاطر ہوا جارہا ہے۔ چنانچہ وہ خود آزاری کو اپنی غلطی کا کفارہ خیال کرتا ہے اور خود آزاری بھی ایسی جس میں وہ اپنی موت سے کمتر کسی بھی شرط پر رضامند نہیں ہوتا۔ مقطعے اور اُس کے پس منظر کی کیفیات پر ہم آگے چلکر روشنی ڈالیں گے۔

اس تجربے سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ یہ کہ غالب کا مخاطب نہ تو کوئی ملکوتی یا آسمانی پیکر ہے نہ کوئی جس کے لب ورخسار ہو وے وروی پروہ فدا ہو رہا ہے۔ اس کا مخاطب گوشت و پوست اور آب وگل کا پیکر ہے، جس سے اس کی امیدیں وابستہ ہیں۔ غالب سراسر اس سے شکوہ کررہا ہے۔ شکوہ بلند آہنگ اور توقع لئے ہوئے ہے۔ یا یوں کہیئے کہ غالب کے خلاف کچھ ایسی باتیں مخاطب سے کہی گئی ہیں جو صحیح نہیں۔ غالب اس شخص سے اس لئے

نالاں ہے کہ اس نے جو کچھ غالب کے خلاف سنا وہ نہ تو درست ہے اور نہ غالب اس سے ان باتوں کے سننے کی توقع رکھتا ہے۔ تیسرے شعر میں "خلوت گہ خاص" استعمال ہوا ہے۔ غالب ابتدا میں اس شخص کو اپنے عتاب کا شکار بنا رہا ہے اور اُسے یہ اندیشہ سرے سے نہیں کہ آیا مخاطب اسکے عتاب کو نہیں سہیگا؟۔ بلکہ وہ اُس خاص خلوت گہ میں جگہ دے گا جہاں اکیلے میں غالب اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کے ساتھ اپنی زبوں حالی اور شکستہ دلی کا اظہار کرے گا۔ غالب کو یقین ہے کہ اس کی توضیح سے مخاطب اپنے کئے پر پریشان ہو گا اسے ندامت ہو گی اور آئینہ اس کی ندامت کو ظاہر کر سکتا ہے۔

لیکن مخاطب کو عتاب کا نشانہ بناتے ہی غالب اپنی جلد بازی اور گستاخی کے احساس سے نادم ہوتا ہے اور مقطع سے پہلے کے شعر میں غمہائے نہانی کی ترکیب لاکر تلافی کے لئے زمین ہموار کر رہا ہے۔ اب مقطع کا شعر لیجئے۔ یہ ایک ڈرامائی کیفیت کا حامل ہے، اور اس میں چار کردار برسر کار ہیں۔ یعنی غالب، مخاطب، نامہ بر اور دوسرا قاصد۔ صورت حال یوں ہے کہ غالب نادم ہو کر اپنی معذرت اور عذر خواہی کی خبر مخاطب کو دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ عملِ تلافی ہے اور اس سے کم کوئی دوسری تلافی مخاطب کو شروع میں مطمئن نہیں کرے گی۔ پس اس مقصد کا خط مخاطب کے پاس کہ غالب عذر خواہ ہے اور معافی کا طلب گار ہے ایک نامہ بر کے ذریعے مخاطب کے پاس بھیجا گیا۔ لیکن اس کے روانہ ہوتے ہی غالب کو اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ یہ عذر خواہی قابل قبول نہ ہو گی غالب کی موت ہی اس سنگین جرم کی تلافی کرے گی۔ اس لئے غالب اپنے کو نیست

کر دیتا ہے اور اس کی خبر مخاطب تک پہنچانی لازمی ہے چنانچہ دوسرا قاصد فی الفور روانہ ہوتا ہے کہ پہلے قاصد کو آدھے راستے ہیں سے جا لے اس سے خط واپس لے اور مخاطب کو زبانی غالب کی موت کی خبر سنائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں غالب اپنی گستاخی کو اس قدر ناقابل تلافی خیال کرتا ہے کہ بجز موت تلافی نہیں ہو سکتی؟ جواب یہ ہے کہ مخاطب ایسے درجہ اور اس مقام پر ہے غالب کو بعد کے خیالات نے اس کی نسبت بے ادبی کا احساس دلایا ہے۔

ان تمام قراین اور شواہد سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ غالب کا مخاطب اس غزل میں ایک ایسا شخص ہے جس سے غالب بڑی امیدیں رکھتے تھے، جس کا احترام ازبس کرتے تھے، جو مالک مملکت ہے جس کی نسبت غالب کی گستاخی اور اس کی بے ادبی ناقابل بخشایش ہے۔ جو خلوت گہ خاص میں غالب کی پریشانی کا حال سن سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پس میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایسا شخص جس کی توصیف مندرجہ بالا شرائط سے ہوتی ہے، بجز بہادر شاہ ظفر کے اور کو نہیں اور جس شخص نے غالب کے خلاف باتیں اس کے سامنے کی ہیں وہ قراین سے ذوق ہی ہو سکتا ہے۔

یہ غزل کئی پہلوؤں کو روشن کرتی ہے جو غالب کی شخصیت سے متعلق ہیں۔ سب سے پہلے غالب کی شخصیت کا انانیتی پہلو نمودار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی انسان دوستی کے عنصر کا پتہ چلتا ہے اور آخر میں غالب اپنے تاریخی اور تمدنی سرمایہ کی وراثت کے اثر میں آتا ہے۔ یہ سب

کیفیات ذہن کی گہرائیوں میں یکے بعد دیگرے پانی کی لہروں کی طرح حرکت میں آکر وسیع اور وسیع تر ہوتی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے بخوبی مربوط اور منسلک ہیں لیکن بظاہر ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتی ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے یہ بتایا ہے کہ اس غزل کے تمام اشعار میں واضح ارتباط اور آمیختگی ہے اور اس لئے عام غزلوں سے جن میں ہر شعر اپنی الگ کیفیات کا حامل ہوتا ہے، قطعی طور پر الگ ہے۔ ناراضگی اور رنجش، شکوہ اور توقع شکست احساس اور ذوق تلافی، حسن ادا اور پاس ادب، ادائے مطلب اور رسائے معانی، ان تمام کیفیات اور لوازمات کے لحاظ سے میں اس غزل کو اہم اور غالب کی فکر کا اعلیٰ نمونہ سمجھتا ہوں۔

مرثیہ غالب (میر مہدی مجروح)

ان سا پیدا کہاں ہو گر سو بار | کھائے چکر یہ چرخ کج رفتار

اس کلام بلیغ کو دیکھو | لفظ اندک میں معنی بسیار

غسل دیتے ہیں آ و مشتا قو | دیکھو حضرت کا آخری دیدار

گرد تابوت تھا ہجوم کثیر | اہل ماتم میں تھی یہی گفتار

جو کہ جاتے تھے ہمرہ تابوت | یہی کہتے تھے وہ پکار پکار

رشک عرفی و فخر طالب مرد

اسد اللہ خان غالب مرد

غالب کی ایک غزل

چند جائزے

غالب کی فکر اور فن تک پہنچنے کے مختلف زاویہ نظر ہو سکتے ہیں اس سلسلے میں ایک عملی آزمائش کے طور پر شعبہ اردو کی جانب سے، غالب کی ذیل کی غزل، شعبہ اردو، فارسی کے سارے اساتذہ اور انگریزی کے ایک استاد کے پاس بھیجی گئی تھی یغزل حسب ذیل ہے۔

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایہ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہر تیغ بسر چشمہ دیگر معلوم — ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے — آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

نالہ سرمایہ اک عالم و عالم کف خاک — آسماں بیضہ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں، اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

اس غزل کے بارے میں پروفیسر آفاق صدیقی استاد شعبہ انگریزی اور ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت نے جو تشریحی جائزے روانہ فرمائے ہیں، وہ میرے اپنے جائزے کے ساتھ درج ہیں۔

پروفیسر آفاق صدیقی
(شعبہ انگریزی کشمیر یونیورسٹی)

۱

غزل کے بارے میں جدید شعرا اور قارئین کو یہ اعتراض ہے کہ غزل میں تنظیم خیال اور تسلسل خیال برقرار نہیں رہتا ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ ایک مختلف خیال کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ بات نظم میں نہیں پائی جاتی اس لئے کسی ایک کیفیت یا شئے سے متعلق خیالات کو بے شمار پیرایوں میں اور عصر نو کے تقاضوں کے مطابق جدید ذہن کے گرد وپیش گھومنے والی تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ نظم میں پیش کرنا زیادہ مناسب اور معقول ہے۔ غزل کا تصور یہ ہے کہ اس کا جسم جدید تصورات یا یوں کہیے کہ ہمارے تصورات کو اپنے میں نہیں پاتا اور اس کا لباس دیرینہ اور روایات زدہ ہے۔ غالب کو پڑھتے وقت جب ہم ان اعتراضات کی وقعت پر غور کرتے ہیں تو خود ہمیں ان کی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اعتراضات خود پڑھنے والے کے کیوں نہ ہوں، مگر غالب کے ایک تفریحی مطالعہ کے بعد خود ہمیں نقص غزل کا الزام مضحکہ خیز محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہاں ایک ایسی ہی غزل ہمارے سامنے ہے کہ جو دو چار صفحات پر مشتمل کسی جدید نظم سے زیادہ دلچسپ اور باوقار ہے۔ سب سے پہلے اس غزل کے مرکزی خیال سے متعلق چند باتیں عرض کرنی ضروری سمجھتا ہوں عام طور پر غزل کا کوئی

مرکزی خیال ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر شعر ایک مرکزی خیال ہوتا ہے۔ مرکزی خیال کی بحث نظم سے متعلق سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہاں اس غزل کے قوافی عام تصور کی تردید کرتے ہیں کہ مرکزی خیال صرف نظم میں ہی ہوتا ہے۔ اور تنظیم خیال میں ردیف اور قافیہ دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ مگر غالب نے غزل کی انھیں خامیوں اور دشواریوں سے کام لیا ہے۔ جس کا تصور بھی ہم مشکل ہی سے کر پاتے ہیں۔ یہ صفت نظم کا خاصہ ہے کہ شاعر اپنے ارادہ کے مطابق اس میں ایک ایسا ماحول پیدا کرتا ہے جو اس کے مرکزی خیال کو زیادہ سے زیادہ تقویت بخشنے اور پڑھنے والے کو اس فضا میں لے جا سکے جہاں سے وہ اپنے گرد و پیش سے قطعی بے خبر ہو اور شاعر کا ہم نوا بن جائے۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ پوری غزل ایک ایسی فضا ہی نہیں تیار کرتی بلکہ ایک ایسا عالم پیدا کرتی ہے جس کی ہر شئے اپنے وجود کے لئے ایک منصفانہ دلیل رکھتی ہے اور ہر جزو ایک ہی کل کی تعمیر کرتا ہے غزل کے اندر آنے ہوئے اسمائے عامہ اس دعویٰ کی دلالت پر کافی ہیں۔ مثلاً باغ، شاخ گل، سایہ۔ افعی۔ جوہر۔ سرچشمہ۔ سبزہ۔ زہر آب۔ تماشہ۔ آئینہ خانہ۔ نالہ۔ سرمایہ۔ کف خاک۔ آسماں۔ مدعا۔ زندگی۔ محفل۔

اس غزل کے مکمل لسانیاتی تجزیہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعد "فعل" کو زیر بحث لایا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس عالم ہست و بود کیلئے جن افعال کی ضرورت ہے وہ بھی موجود ہیں یا نہیں اس امر کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوسرے اور پانچویں شعر کے آخری مصرعے بہت اہم ہیں۔

ایک اگر زندگی کی نمود پر دلالت کرتا ہے تو دوسرا اس کے خاتمہ پر۔ اس طرح سے ان دو افعال کے ذریعہ کائنات میں متصور سارے افعال کا احاطہ ہو جاتا ہے لہذا اجمال کی جو شکل شاعر یہاں پیش کرتا ہے وہ قطعی طور پر حقایق پر مبنی نظر آتی ہے۔ آیئے اب ذرا اس عالم کی تنظیم کا جائزہ لیں جو شاعر کی اپنی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اگر ہم تسلیم کرلیں کہ خدا نے تخلیق عالم کے ذریعہ خود اپنی کیفیات اور احساسات کو ایک مادہ کی شکل دالی ہی کہلاتے ہیں۔ مشہور اطالوی ناول نگار البریو موراویہ (Alberio Moravia) کے قول کے مطابق تخلیق عالم کا اصل سبب خود خدا کو اپنی یکتائی اور تنہائی سے اکتاہٹ اور بیزارگی تھی۔ اس کی بیزارگی اور بوریت (Boredom) کی شدت کا احساس اس بات سے صاف اور واضح ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے پھر جو کچھ پیدا کیا اس کو اختلاف اور تضاد سے متصف کر دیا۔ کیوں کہ اس کی اپنی ذات ان صفات کی حامل نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح شاعر اپنے گردوپیش کے حقایق سے اکتا کر یا ناآسودہ ہو کر یا بیزار ہو کر ایک عالم تخلیق کرتا ہے جس کے مشاہدہ سے اس کی ناآسودگی اور اکتاہٹ کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ شدت آسودگی کے اندازہ کے لئے ہمیں اس تفاوت راہ کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے جو شاعر کی اپنی دو حیثیتوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ایک حالت میں وہ جہاں وہ خالق ہے اور دوسری حالت وہ جہاں وہ خود مخلوق ہے۔ یہاں پر شاعر کی فنی صلاحیت اور اس کی تخلیقی قوت کی برتری اس بات پر بھی منحصر ہوتی ہے کہ

عام پڑھنے والے تو خود کو شاعر کے پیدا کردہ عالم کا ایک جزو سمجھنے لگیں اور
عالم حقیقی اور عالم خیالی میں تفریق نہ کر پائیں لیکن ایک ناقد یا مبصر جب اس کا
مطالعہ کرے تو اس کی نظر میں ان دونوں عالموں میں جو فرق ہے وہ نمایاں تر نظر
آجائے۔ اور اسی فرق یا اختلاف کی بناء پر وہ شاعر کی فنی اور تخلیقی قوت کا
اندازہ کر سکے۔ آئیے اب دیکھیں اس غزل کی دنیا میں شاعر کا اپنا مقام اور
اس کی حیثیت کیا ہے۔ غزل کے اندر جتنے افعال شاعر بیان کرتا ہے وہ سب
غیر ارادی ہیں اس کی اپنی ذاتی قوت کی کارکردگی کا کہیں شائبہ تک نہیں
ملتا جس سے اس کے عالم جبر میں محصور ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی مجبوری کا
عالم یہ ہے کہ "باغ" جو خود استعارۃً اس کا اپنا مسکن ہے جہاں کی ہر شئے
اسے عزیز ہے اور جس کے لئے وہ سب کچھ قربان کر سکتا ہے اب وہی اسے
وحشت قلب کا مریض سمجھتا ہے۔ اور اس کا تمسخر اڑاتا ہے اس کی
انتہا یہ ہے کہ اس باغ میں سایہ شاخ گل بھی اسے سانپ نظر آتا ہے۔ اب یہ سوال
پیدا ہوتا ہے کہ اگر سایہ شاخ گل افعی نظر آتا ہے۔ تو کیا ہوا شاعر کو تو پتہ ہے
کہ یہ در اصل افعی نہیں ہے لیکن یہ ایک عجیب کیفیت ذہنیت ہے کہ اسے
اپنے خفقانی ہونے کا بھی احساس ہے اور اسی احساس کی وجہ سے ہر شئے کی
حقیقت اس کی نظر میں مشکوک ہے۔ اس امر سے یہ بات بھی واضح ہو گی کہ
جب انسان کو خود اس کی ذات مشکوک نظر آنے لگتی ہے اور وہ اس کی
صحت اور عدم صحت سے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوتا ہے تو اس کی
نظر میں خارج کی بھی ہر شئے کی حقیقت مشتبہ اور مشکوک ہو جاتی ہے۔ جب

خود اس کی اپنی داخلی دنیا (Microcosm) وحشت خفقان میں مبتلا ہے تو عالم خارجی کی ہر شئے اس کی وحشت کے تناسب سے غیر متناسب اور مسدود نظر آئے گی۔ اسی طرح خارجی دنیا کا حقیقی وجود خفقانی کے لئے بے معنی اور بے مقصد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے اثبات کی نفی لازم آتی ہے۔ غالب کا یہ شعر نفسیات کے ایک طالب علم کو بھی دعوت فکر دیتا ہے۔ اس لئے کہ ایک خفقانی کی دماغی حالت کا مطالعہ اور اس کے افعال کا مشاہدہ انسانی زندگی سے متعلق اور اس کے عوارض سے متعلق بہت کچھ معلومات فراہم کرتا ہے۔ اب ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اس خفقان کا سبب کیا ہے؟ جب ہم اس کے اسباب کی جانب نظر کرتے ہیں تو مختلف خیالات ذہن میں آتے ہیں۔ باغ اور افعی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر غور کرتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خلد غالب کی نظر کے سامنے ہے اور یہ مطالب کا آدم' کی زبانی عرض حال ہے جو شاعر کے قلب و ذہن میں پوشیدہ ہے۔ اس خفقان کی وجہ محرومی فردوس بھی ہو سکتی ہے اور شدت احساس خلد بھی ہو سکتی ہے۔ چونکہ سانپ ہی خلد کے عیش و نشاط کا ایک سبب تھا اس لئے ہر طرح سے چین و سکون اور عیش و راحت کے مقام پر اس کا خوف فوراً ذہن میں بیدار ہوتا ہے۔ اور ڈر یہ لگتا ہے کہ یہ عارضی سکون بھی کہیں قبل از وقت ہم سے نہ چھین جائے۔ یہ ڈر اس لئے اور شدید ہو گیا ہے کہ جس کے کھونے یا جس سے محروم ہونے کی کبھی توقع بھی نہ تھی اس سے محروم ہونا پڑا تو اب جو راحت جان و دل عارضی طور پر اس باغ سے وابستہ ہے وہ بھی اس خوف سے تلخیوں میں بدل جاتی ہے کہ یہ راحت تو کسی لمحہ بھی ختم ہو سکتی ہے۔

اندیشہ ہی مایوسیوں کو جنم دیتا ہے اور احساس نامرادی ہی وحشت اور خفقان تک لے جاتا ہے۔ اس شعر کا دوسرا روایاتی مفہوم اگر نظر میں رکھئے تو یہ بحث چند ہی سطروں میں ختم ہو جائے گی کہ شاعر کے خفقان کا سبب کیا ہے۔ اور سایہ شاخ گل، شاعر کو کیوں کر افعی نظر آتا ہے۔ غالباً اس کی شرح بآسانی یوں کی جاسکتی ہے کہ عاشق وصل کا ایک مدت سے تمنائی رہتے رہتے اب مایوسیوں کا شکار ہو کر خفقانی ہو گیا ہے اور اس کے ثبوت میں دوسرا مصرعہ کافی ہے کہ سایۂ شاخ گل اسے افعی نظر آتا ہے۔ شاعر کا کمال یہ بیان کیا جائے گا کہ کس خوبصورتی سے اس نے شاخ کے سایہ کو سانپ ٹھہرایا اور غالباً گل کے سایہ کو جو شاخ میں لگا ہوا ہے سانپ کا پھن' قرار دے کر اس کی تکمیل کر دی ہے۔ اب اس کے آگے اور کچھ کہنا شاید دور کی کوڑی لانے کے مترادف کہلائے یا پھر شاعر پر تہمت رکھنے کے برابر سمجھا جائے۔ اور یہ بھی کہا جائے کہ اوپر جو کچھ مذکور ہے شاعر کو اس کی خبر بھی نہ رہی ہوگی۔ دراصل یہ انداز فکر ہی سراسر غلط ہے کہ ہم شعر کا وہ مفہوم سمجھنے کی سعی کریں۔ جو اس کے شعور کی زینت تھا۔ عربی کا ایک محاورہ ہے المعانی فی بطن الشاعر یعنی شاعر کا مفہوم شاعر کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ جس کا علم کسی دوسرے کو نہیں ہوتا تنقیدی عمل اس امر کا متقاضی ہے کہ ناقد شعر کے مفہوم اور اس کی تصور کی گہرائیوں کو اس طرح روشن کرے کہ لطف کلام میں تنقیدی مطالعے سے کئی گنا اضافہ ہو جائے نقد و تبصرہ سے اگر لطف کلام بڑھتا ہے تو یہی تنقید تعمیری کہلاتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ فنون لطیفہ میں (جن میں سے شاعری بھی ایک ہے) تلاش حقیقت بے معنی ہے۔ یہاں حقیقت سے

مراد وہ حقیقت ہے جو عرفِ عام کی حقیقت ہے ۔ اس کے برخلاف ایک حقیقت اور بھی ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے "ولاکن الا الشعرون" لیکن تمہیں اس کا ہرگز شعور نہیں ہے ۔ یہ بات اس وقت کہی گئی جہاں یہ بتایا گیا کہ راہ خدا میں مرنے والے زندہ ہیں اور ان کو ان کے رب کی جانب سے رزق پہنچتا ہے لیکن ان کی حیات کا تم کو شعور نہیں ہے ۔ یہ بات عام لوگوں کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے لیکن ان عام لوگوں میں سے جدا ایک حلقہ عارفان بھی ہے جسے حیات بعد الممات کا شعور ہے ۔ اس طرح کی حقیقت کا شعور جب ایک قافیہ ساز کو ہونے لگتا ہے تو وہ شاعر کہلاتا ہے، اور اس کی عظمت کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ وہ کہاں تک اپنے اس کا شعور جس کے سامنے حقیقت ظاہری حقیقت باطنی سے حجابات اٹھاتی ہے، اور فریب النباس کا پردہ صاف ہو کر غلبہ تشکیک کو نابود کرتا ہے ۔ اپنے قارئین تک اپنے کلام کی اس طرح فہم کلام اور نکتہ دانی پڑھنے والے کے ذہن کو اور ذکاوت فہم کا معیار تعین کرتی ہے ۔ یہ ساری باتیں شعور کے ضمن میں آگئیں ۔ اب اس غزل کے دوسرے شعر کا جائزہ لیں اور دیکھیں کیا کیا گہر ہائے معانی ہاتھ آتے ہیں ۔ جیسا کہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کمال مجبوری میں آدمی ہی اس شئے کا جس کا پہلے وہ اثبات کر چکا ہے نفی کرنے لگتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو امیدیں اس کے اثبات سے وابستہ تھیں وہ بر نہ آئیں اور نہ مستقبل میں اس کا امکان ہی باقی رہا تو ایسی صورت میں انھیں چیزوں کے وجود سے انکار اپنی بقا کے لئے لازمی آتا ہے ۔ یہی بات اس شعر میں شاعر نے واضح کر دی ہے کہ تلوار کی وہ دھار جسے دہر میں سمجھا کر قاتل نے زیادہ

تہلک بنا لیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا وار میرا خاتمہ کر دے گا لیکن
ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ زہر ملاہل میں بجھی ہوئی تلوار سے زخم کھانے کے بعد
حقیقت ظاہری کے اصولوں کے مطابق ہلاکت یقینی ہے۔ لیکن اب
دیکھیے یہاں شاعر کا وہ غیرمعمولی شعور جس نے اسے عارف کا مقام عطا
کیا ہے کس طرح دوسرے مصرعہ میں اس یقین عام کی دھجیاں اڑاتا ہے۔
وہی زہر آب جسے قاتل اس کی ہلاکت باعث سمجھتا ہے شاعر کی بقاء و نمود
کا ضامن ہے۔ دیکھیے یہ وہی بات ہے جس کے لیے میں نے ولا کت
الا الشعراء دن کا حوالہ دیا تھا۔ ترتیب شعر کی مناسبت پر ذرا غور کیجیے
تو اس شعر کے مطالعے کے بعد ترتیب کا پایا بہت بامعنی نظر آتا ہے امید ہے غزل
سے شکایت کرنے والے بھی شاید اس نکتے سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔
پہلے شعر میں جس طرح باغ نے سایۂ شاخ گل کو سانپ بنا کر شاعر کا مذاق
اڑایا ہے ٹھیک اسی طرح دوسرے شعر میں شاعر نے بھی تخریبی قوت کا تمسخر
اڑا کر پہلے والی ضرب کا اچھا بدلہ لیا ہے۔ ان دو اشعار کو بار بار پڑھیے اور
ان کے صوتی اور معنوی پہلو پر پھر غور کیجیے تو ایک پہلو اور روشن ہو جاتا
ہے، اور ایک نفسیاتی سوال جو میرے ذہن میں اٹھا تھا اس کا جواب بھی دیا
جاتا ہے۔ یہ بات عام تجربہ میں آتی ہے کہ جب ہمارا کوئی مذاق اڑاتا ہے اور
ہم اس تلخ اور ناپسندیدہ واقعہ کو جب بطور حکایت پیش کرتے ہیں تو اس کا لہجہ اور
انداز فطرتی طور پر کچھ مدھم اور پھیکا پھیکا سا ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ
تمسخر کی بات ہی ہمارے نفس کو ناپسندیدہ رہی ہے اس کے برعکس جب ہم فتح و نصرت

کی داستان سناتے ہیں تو ہمارا لہجہ اور انداز کچھ اور ہوتا ہے۔ اس فطرت انسانی کو بھی دونوں اشعار انفرادی طور پر اچھی طرح نمایاں کرتے ہیں۔ اب رہ گئی بات مرکزی خیال کی۔ جس کے بارے میں ابتداء ہی میں میں نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے کہ کمال جبر و بے بسی اس پوری غزل کا مرکزِ خیال ہے۔ پہلے ہم نے دیکھا کہ شاعر نے تیغ قاتل کو چیلنج کر کے جہاں اپنی برتری کا ثبوت پیش کیا تھا اب وہی مصرعہ جب ہم احساس جبر کی انتہا کو پیش نظر رکھ کر پڑھتے ہیں' وہی لہجہ جو پہلے احساس تفاخر و برتری کا حامل تھا اب شاعر کی حد درجہ بے بسی اور مجبوری پر دلالت کرتا ہے۔ وہ سبزہ خود رو نہیں ہے بلکہ اگایا جاتا ہے۔ جس کی نمو و پرورش کسی اور قوت کے ہاتھ میں ہے۔ اسی خیال کو غالب کے ایک دوسرے زبان زد شعر کے ساتھ پڑھئے اور لطف تضاد سے محظوظ ہوجیے۔

زندگی اپنی جو اس طرز سے گذرے غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ عمر وہی عمر ہے جو " زہر آب " کی رہین منت رہی ہے اگرچہ چشمہ حیواں کے کنارے گذری۔

اب آئیے تیسرے شعر کا مدعا کہنے کی کوشش کریں۔ نظر عام میں یہ مدعا وصال یار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اگر آئینہ خانہ میں غالب کے ہم قدم چلئے تو شاید شکست دل کی گونج کا کوئی حصہ آپ کے کانوں تک بھی آپہنچے اور پھر شاید آپ بھی اس مدعا کو بے پردہ دیکھ لیں جو محو تماشائے شکست دل ہے۔ غالب کے مدعا سے متعلق کچھ قیاس آرائی کرنا دراصل اس وقت مشکل ہو جاتا ہے۔ جب اس کا

قول اس کی تعریف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ دیوان کی پہلی ہی غزل میں یہ تعریف یوں ملتی ہے:

ع مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اس انکشاف حوصلہ شکنی کے بعد کس کی جرات ہے جو اس کی تلاش میں سر مارے۔ لیکن بعد میں ایک دوسری جگہ پھر فرماتے ہیں:

ہم بھی مُنہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

پہلے مدعا عنقا تھا جس سے غالباً مراد یہ تھی کہ مدعا ناپید تھا یا مدعا کچھ تھا ہی نہیں پھر اس بات کی شکایت ملتی ہے کہ یہ پوچھا ہی نہیں جاتا کہ آخر اس اظہار کا مدعا کیا ہے ؟ کیا ہے ؛ مدعا عنقا ہے۔ لیکن جب یہاں اس غزل میں مدعا محو تماشا نظر آتا ہے تو اس کی ایک جیتی جاگتی شکل سامنے آتی ہے جس سے پہلے والے دعویٰ کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یعنے پہلے جسے عنقا کہا گیا تھا اس سے مراد ایک غیر معمولی اور مشکل تصور کے احاطہ میں آنے والے مدعا کی طرف اشارہ تھا۔ مدعا سے متعلق ان تین مختلف اشعار کو ذہن میں رکھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورا دیوان ایک ہی عنوان کے تحت ایک مسلسل تقریر ہے۔ اور یہاں سے میں پھر اس عالم کی طرف اشارہ کرونگا جس کا پہلے ذکر کر چکا ہوں یعنے شاعر کا وہ عالم تخیل جو خدا کے عالم اسباب کی ضد ہوتا ہے۔ اور اس ضد کا سبب اس کی اس عالم آب و گل سے مایوسی اور بیزاری ہوتی ہے۔ چونکہ شاعر کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اس عالم شمس و قمر کے وجود کا کچھ مدعا ضرور ہے۔ لہٰذا عالم تقریر جس کا

خالق اس کا شعور ہے اس کا بھی مدعا لازمی طور پر عنقا ہی ہونا چاہئے لیکن بعد میں جب یہی عنقا محو تماشائے شکست دل نظر آتا ہے تو ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود شاعر کے "عالم تقریر" کا تماشا ایک عالم حیرت سے کر رہے ہیں بات عالم سے گذر کر اب عالمین تک آگئی۔ خالق ازلی کی تخلیقی صفت سے یہاں شاعر کو مماثلت حاصل ہو جاتی۔ اس طرح منزل بہ منزل عروج فن تک پہنچنا اور اس کا شعور قاری تک پردہ در پردہ منتقل کرنا، یہ قافیہ سازوں کے بس کا کام نہیں تو یہ صرف آفاتے فنا ہی کر سکتا ہے۔ تماشائے شکست دل کی اہمیت یوں تو کچھ نہیں ہوتی لیکن یہ تو شاعر کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے۔ یہاں وہ قادر مطلق ہے۔ اور اگر چاہئے تو خطرہ کو سمندر کر دے۔ ذرا سوچئے کہ تماشائے شکست دل کو اہمیت کا حامل بنانے کے لئے ہم کو تو نہ جانے کتنے جتن کرنے پڑتے اور یہ کام جب بھی شرمندۂ تکمیل نہ ہوتا مگر یہاں شاعر کے لئے "کن فیکون" والی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس نے بیک جنبش قلم فانی کو ابدی بنا لیا۔ اس جنبش قلم کی گل کاری کیا ہے وہ نقطۂ مدعا بنا ہے گا۔ وہی مدعا جو عنقا تھا جو چشم انسانی کے دائرہ بصیرت سے خارج تھا جس کی نہ ابتدا کا کسی کو علم نہ انتہا کا۔ وہی اس کو تماشائے شکست دل ہے لیکن حسن و خوبی کے ساتھ شاعر اپنی خلاقی کا تماشا دکھاتا ہے! یہ دنیا اس کی مخلوق ہے۔ ہر پست و بلند اس کی مرضی کے مطابق ہوگا، وہ جب چاہئے فنا کو بقا سے اور بقا کو فنا سے تبدیل کر دے۔ کون ہے جو اس سے باز پرس کرے شکست دل کو بقا عطا کرنی تھی تو مدعا، کو محو تماشا کر دیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ شکست دل سے آئینہ خانہ کی تعمیر ہوگئی۔ ادھر بگاڑا۔ اُدھر سنوار دیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ تخریب سے تعمیر کا کام لیا۔

یہ اسی کی قدرت کی نمائش ہے جو فن کی دنیا کا خالق ہے اس موقع پر مجھے اپنے ایک ساتھی کا بڑا دلچسپ اور بڑا خوبصورت شعر یاد آگیا جو اس تخریب کو تعمیر سے افضل قرار دیتے ہوئے تاریخ سے ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ یہ شعر ہے :

تخریب حسین کر دیتی ہے تعمیر کے نقش ناقص کو
بت خانہ کی قسمت کیا کہیے اجڑے تو حرم ہو جاتا ہے

یہ بات تو ابھی باقی ہی رہ گئی ہے کہ باعث شکست دل کیا تھا اور شکست سے کس کی فتح ظہور میں آئی ہے غور کیجئے تو ایسا پتہ چلتا ہے کہ فتح اسی مدعا کی ہے جو محو تماشہ ہے۔ محو تماشہ ہونے سے مدعا، کی شکست دل پر مسرت اور دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے اس سے ایک جانب تو یہ ظاہر ہوتا ہے "دل" سے مدعا، کو جو عناد تھا وہی باعث شکست دل ہوا۔ دوسری جانب وہ مفہوم بھی نمایاں ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مدعا "سلامتی قلب" کا دشمن نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم کرم فرما ہے۔ جو دل کو آئینہ خانہ میں بدل کر اسے دوام عطا کرنا چاہتا ہے۔ جہاں تک الفاظ کے سطحی اور روایتی مفہوم کا تعلق ہے، اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ غزل کے قوافی کی حیثیت سے جو افعال استعمال کئے گئے ہیں ان سے شاعر کی زیست پر جو عالم جبر طاری ہے وہ محتاج تشریح نہیں لیکن اس وقت ہمارا تنقیدی نقطہ نظر تصدیق روایات نہیں ہے اور نہ بلا تکلف اعتراف عظمت غالب ہے بلکہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہیں ان الفاظ کو جسے شاعر نے شاعرانہ تنظیم کے تحت لا کر نیا حسن اور نیا مفہوم بخشا ہے اپنی چشم تصور کے قریب لا کر ان کے مفاہم و مطالب کی وسعت و گہرائی کا جائزہ لے رہا ہوں یہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں ضروری نہیں ہے کہ

ہر شخص کو اسی طرح دکھائی دے جس طرح میری چشم خیال کو نظر آتا ہے۔ مجھ سے زیادہ گہرے تصور کا حامل اس سے بھی زیادہ گہرائی یا بلندی تک کی خبر دے سکتا ہے یہ اپنی اپنی قوت تجزیہ پر موقوف ہے یہ بات عین گستاخی پر مبنی ہوگی اگر یہ کہیں کہ میں سخن فہم ہوں غالب کا طرفدار نہیں لیکن اس بات کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں حافظ شیرازی کی اس نصیحت پر عمل کرنا عین سعادت سمجھتا ہوں جو ان کے شعر میں محفوظ ہے:

کمال صدق و محبت بہ بین نہ نقص گناہ
کہ ہر کہ بے ہنر افتد نظر بہ عیب کند

بات غالب کے شعر سے اپنی گستاخی اور سعادت تک آگئی جس کے لئے پڑھنے والوں کو شاید کوئی جواز نہ ملے لیکن کیا کیجئے بات میں بات نکل ہی آتی ہے ویسے میں اپنے خیال سے اسے مستحسن نہیں سمجھتا۔ گفتگو تماشۂ شکست دل تک آچکی تھی اور اب ذکر آئینہ خانہ کا ہونا تھا۔ شاعر کی مجبوری کا بھی ذکر ہو رہا تھا یہ مجبوری درجہ کمال تک اس وقت پہنچتی ہے جب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ شاعر نہ تو خود آئینہ خانہ بنا سکا اور نہ خود اس کی سیر کرنے کی آزادی ہی رکھتا ہے جبکہ یہ آئینہ خانہ خود اس کے اپنے قلب سے ہی تعمیر ہوا ہے۔ ذرا سوچئے یہ امر کس قدر مایوس کن ہے کہ میں اپنے ہی خون جگر سے سینچے ہوئے چمن میں جانے کے لئے کسی غیر کی اجازت اور رہبری کا محتاج ہوں۔ شدت مایوسی کی لفظی تجدید بھی "کوئی" نے ختم کردی۔ شاعر اس ذات کو یا تو پہچاننے سے قاصر ہے یا پھر اپنے کو بے پردہ نہیں کرنا چاہتا۔ صرف لفظ "کوئی" کو مصرعہ سے خارج کیجئے اور افلاس معنی کا غلبہ دیکھئے شعر اگر

خود اپنی ہستی سے متعلق کچھ کہہ سکتا تو شاید یہی کہتا کہ میں اپنے اظہار معنی کے لئے "کوئی" کا محتاج ہوں اپنی بقار اور وجود کے لئے کسی دوسرے کی کرم فرمائیوں کا احسان مند ہونا توہین وجود ہے۔ نکتہ۔ یہ نکتہ غالب کے اپنے مزاج کے پس منظر میں اور زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ تکمیل معنی کیلئے فعل کی غرض و غایت پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ یہ سوال قطعی مناسب ہوگا کہ جو "کوئی" کا مخاطب ہے صاحب دل کو آئینہ خانہ میں کیوں لے جاتا ہے۔ لے جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ جو لے جا رہا ہے وہی فاعل ہے اور جسے لیجایا جا رہا ہے وہ معذور ہے مجبور ہے فاعلیت کی صلاحیت سے محروم ہے لہذا اپنی حیثیت کے اعتبار سے بمقابلہ فاعل حقیر و کمتر ہے یہ اظہار کمتری و حقارت پھر کمال جبر ہی تصدیق کرتا نظر آتا ہے۔ آئینہ خانہ میں لے جانے کا مقصد غالباً یہ ہے کہ وہ خود "کوئی" ہے جو اپنی فتح و نصرت کا اعتراف "صاحب دل" سے چاہتا ہے اور اس پر یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ جس دل پر اسے ناز تھا وہ دل دراصل ایک مہمل سی شئے تھا۔ یہ اوس کا کرم ہے کہ اُس نے اسے آئینہ خانہ بنا دیا اور اس آئینہ خانہ میں اب وہ اسے اس لئے ساتھ لیجاتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کی حقیقت سے روشناس ہو جائے جس سے اب تک وہ قطعی ناآشنا تھا اس شعر کے بعد پھر وہی انداز تمسخر و حقارت واپس آتا ہے جیسے ہم نے دوسرے شعر میں دیکھا تھا لیکن یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ جب عالم کف خاک ہے اور آسمان بیضہ قمری ہے تو ایسی کائنات کے سرمایہ برناز کیا معنی؟ اس بیان کی توجیہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس شعر کو اگر اظہار حقیقت سمجھیں تو مفہوم یوں ہو گا کہ شاعر کو یہ علم ہے کہ لوگ کہتے ہیں نالہ سرمایہ عالم ہے لیکن

ایسے عالم کا سرمایہ بھی کیا ہوگا جس کی قدر وقیمت کف خاک سے زیادہ نہیں یہاں تحقیر ارض وسماء سے پہلے تو شاعر کا احساس برتری نمایاں ہوتا ہے اور دوسری جانب وہ اس عالم ہست وبود کی نفی کرکے اپنا وہ فرض بھی ادا کرتا ہے جو بہ حیثیت فن کار اس پر عاید ہے جیسا کہ میں نے بحث کی ابتداء میں ذکر کیا کہ معنوی تضاد کو جدت معنوی سے افضل بنانا ہی معراج فن ہے اس قول کی تائید کے لئے غالب کے کلام سے سینکڑوں دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں زاویہ نظر بدلتے جلئے تو مفہوم بھی عین اسی زاویہ کی مناسبت سے ابھرتا نظر آتا ہے احساس جبر کی بات کو زیر نظر رکھتے ہوئے اس شعر کو پڑھیئے تو اس شعر کو غزل کے پہلے شعر سے معنوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے یعنی اس خفقانی کا خیال آجاتا ہے جیسے "باغ" ڈراتا ہے یہاں جو ذہنی کیفیت بیان کی گئی وہ یوں ہے کہ ایک جانب تو میں خود اپنے نالوں کو سرمایہ عالم سمجھتا ہوں اور اسے متاع زیست سمجھ کر سینے سے لگائے رہتا ہوں لیکن دوسری جانب اس ارض وسما کی قیمت میری نظر میں ایک مشت خاک نظر آتی ہے یہ عجیب حالت ہے کہ ایک ہی شئے کبھی سب سے زیادہ بامعنی معلوم ہوتی ہے اور کبھی لغو ومہمل نظر آتی ہے اور وہ خود اپنے سے کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مجھے خفقان ہوگیا ہے۔

اختتام تقریر دیکھئے کس قدر منطقیانہ ہے کہ ابتداء یوں کی تھی کہ میں وہ سبزہ ہوں کہ جسے زہر آب اگاتا ہے۔ باغ سے سبزہ تک آتے پھر زندگی کے تجربات اور عقائد اور تصورات سے متعلق گفتگو کی اب چلنے چلانے کی باری آگئی تو ان کی محفل کا بھی ذکر آگیا اور ان کی محفل سے زمانہ حیات میں کیا اور کس طرح کا

رابطہ اور واسطہ تھا وہ بھی عرض کر دیا اور تمام تقریر کے ساتھ خاتمہ زیست کی بھی خبر دے دی اس شعر میں کمال مجبوری کو فوقیت دی ہے پہلے مجبوری یہ تھی کہ ان کی بزم میں بیٹھ نہیں سکتا تھا اٹھا دیا جاتا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ اٹھا دیئے جانے پر بظاہر اس کے دست و پا ہی حرکت میں آتے تھے اگرچہ وہ حرکت اس کے اپنے ارادوں کی وجہ نہ ہوتی مگر کم از کم دل کے بہلانے کو تو کہہ لیتا تھا کہ وہ خود چلتا ہے مگر وہ مجبوری کمال کو اس درجہ پہنچی ہے کہ وہ بات بھی نہیں رہی بلکہ اب تو پا بدست دگرے دست بدست دگرے کی نوبت آ چکی ہے۔

ارتقاء خیال اور نظم تخیل کو دیکھئے کتنی خوبصورتی سے منزل کمال تک لے جاتا ہے اور انہیں پانچ اشعار میں اپنی جذباتی اور شعوری سوانح حیات مرتب کر کے حد درجہ فنکاری کا ثبوت دیا ہے اور کہیں بھی اس عالم تقریر کو جس کا مدعا پہلے عنقا تھا صوتی اور معنوی اعتبار سے متوقع معیار سے گرنے نہیں دیا۔

رفعت پرواز

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

شاہد مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچہ دلی گل شیراز پر

آہ، تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

(اقبال منقول)

ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت

مقطعے کو چھوڑ کر غزل کے باقی چاروں شعر فارسی ترکیبوں کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس غزل کو غالب کے اردو کلام کے اس حصے میں شامل کیا جائے گا جس میں فارسیت کی افراط ہے اور جو غالبؔ اس کی زندگی کے ابتدائی دور کا کلام ہو سکتا ہے جبکہ وہ فارسی میں ہی کہنے کی طرف مائل تھا اس لحاظ سے غزل میں اس روش کا خاصہ اثر دیکھا جا سکتا ہے جس کو فارسی والے "سبک ہندی" کا نام دیتے ہیں صنعت گری اس سبک کی اہم خصوصیت ہے شاعر معنی سے معنی نکالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک تیج در پیچ معنی کو ایک شعر کے مختصر سے قالب میں سموتے کے لئے شاعر مجبور ہوتا ہے کہ از بس چست بندشیں یا محکم الفاظ استعمال کرے چنانچہ اس کا ثبوت اس غزل میں خفقانی ' شاخ گل ' جوہر تیغ ' سر چشمہ زہر آب ' مدعا ' محو تماشہ ' شکست دل ' آئینہ خانہ ' سرمایہ یک عالم ' ببضہ قمری ' سے مل سکتا ہے۔ اس قسم کے اشعار میں یقینی آمد نہیں ہوتی اور نہ ہی ان میں تاثر ہوتا ہے اگرچہ ترکیبات کے شکوہ سے ہم ضرور مرعوب ہوتے ہیں اور اجمالی طور پہ شعر بہت بلند آہنگ معلوم ہوتا ہے لیکن فارسی کے بہت کم

استادیں جو شکوہ الفاظ یا تراکیب سے آہنگ معا کے ساتھ معنی کی وجاہت کو پیدا کر سکتے ہیں۔ بطور مثال منوچہری کے مشہور قصیدے کا یہ شعر ملاحظہ ہو جو سیلاب کے بیان میں کہا گیا ہے' اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ شکوہ الفاظ نے آہنگ اور محاکات کے باہمی امتزاج کی تقویت کی ہے اور شعر ہر لحاظ سے پُر اثر بنا ہے۔

زکوہ ہا سیلہا برخاست ہر سو   دراز آہنگ و پیچان و زمین کن

غالب نے اپنے عصر کے قریب ہندوستانی کے فارسی گو شاعروں کا کلام وقت سے پڑھا تھا اور ان سے بڑی حد تک متاثر ہوا' مخصوص ظہوری' بیدل' عرفی' خفائی وغیرہ۔ یہ سب ایک خاص روش پر چلنے والے شاعر تھے جنہیں ایران میں پسند نہیں کیا گیا ادھر غالب چونکہ اپنی طبیعت میں جدت رکھتا تھا۔ اس نے اس نے اردو شاعری میں اس روش کو لانا چاہا۔ اسی کوشش کے نتیجے میں یہ غزل اور اس کے ساتھ کی دوسری ہم قطار غزلیں معرض وجود میں آئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی جدت پسندی میں شامل معایب یا مشکلات کا احساس غالب کو بخوبی ہوا اور تب ہی جا کر کہا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ فارسی کی اتنی ثقیل ترکیبیں اردو کے لئے گراں بار ہو گئیں۔ اور اس انداز کا کلام لوگوں کے لئے ناقابل فہم بن گیا اور غالب کو اس بات کا احساس بھی ہوا جب اس نے کہا کہ "نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی" تو وہ اسی وقت اور مشکل کی طرف اشارہ کر رہا تھا نہ کہ اپنی خود سری اور شعر گوئی کا دعوی کر رہا تھا۔

اس پس منظر کے بعد ایک اور نکتے کی طرف میری توجہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ دعویٰ

دلیل یا ارسال مثل کی روشن فارسی شاعروں کے ہاں (یعنی ہندوستان کے فارسی گو شاعروں) ابتذال تک پہنچ گئی۔ چنانچہ غنی کشمیری نے کس طرح اپنا شاعرانہ سرمایہ اس ایہ معنی صنعت گری کے ہاتھوں برباد کیا سب جانتے ہیں لیکن غالب نے اس تباہی سے ایک قدم پہلے ہی اپنے آپ کو روک لیا۔ اس نے دعوی دلیل کی صنعت گری کو نیم راہ میں ہی چھوڑ دیا اور چونکہ بنیادی طور پر وہ منطقیات سے بہت لگاؤ رکھتا تھا، اس لئے شعر میں کسی ایک لفظ یا ترکیب کے وارد کرنے سے ایک اور ہی منطقی نتیجہ یا مسئلہ پیش کیا۔ اسی نے خفقانی کی مناسبت سے افعی، جوہر تیغ کی نسبت سے زہر آب، شکست دل کی نسبت سے آئینہ خانۂ عالم کف خاک کی مناسبت سے آسمان اور بیضۂ قمری لایا ہے۔ اس منطقی روش گفتار سے وہ اپنے آپ کو دلیل و دعویٰ کے چکر سے آزاد کرتا ہے اس میں اس کا ابتکاری ذہن قابل تعریف ہے۔

بہر حال میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ اس غزل میں غالب کی آگے چلکر نمودار ہونے والی صلاحیت کا اشارہ ملتا ہے اور غزل چنداں پُر تاثیر نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مہمل ہے۔ میں غالب کے کلام کے کسی بھی حصے کو مہمل خیال نہیں کرتا اس غزل میں ممکن ہے کہ پہلے چار شعر ایک ہی کیفیت اور احساس سے متعلق ہوں لیکن اس احساس کو حسین کی دھندلی سی صورت ہمیں ضرور نظر آتی ہے، غالب واضح طور پر ہم تک پہنچانے میں کامیاب نہیں رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک خیال کی کئی شاخیں نکل آتی ہیں۔ یہ شاخیں ایک دوسرے سے الجھ جاتی ہیں اور اصل بات ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ مثلاً تیسرے

شعر پر غور کیا جائے تو شعر کا لب لباب یہ ہے کہ میری بیشمار آرزوئیں تھیں، کوئی پوری نہ ہو سکی۔ جب دل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا تو ہر ٹکڑے میں ایک آرزو کا نقش دیکھا جا سکتا تھا، چونکہ دل کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں، اس لئے دل کے سینکڑوں ٹکڑوں کو جن میں سینکڑوں آرزوئیں نقش ہیں، ایک آئینہ خانہ بنایا ہے، اور مدعا دسی آئینہ خانہ میں محو تماشا ہے۔ غالب جانتا ہے کہ اس شعر کے ذریعے اپنے خیال کو قاری تک پہنچانے میں ابھی کچھ کسر باقی رہی ہے۔ چنانچہ وقت گذرنے کے ساتھ وہ سادہ تر اور پر اثر تر انداز سے اسی مطلب کو بیان کرتا ہے۔

یعنی "کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں" یا

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ظاہر ہے کہ شعر مذکور میں صنعت گری زیادہ ہے اور رسائی کم۔ یہی حال پوری غزل کا ہے۔ ہمیں یہ قبول کرنا چاہیئے کہ ہر عظیم شاعر ایک انسان ہے اور اس کا ہر دن نئے نئے اور تازہ تازہ تجربات کو لیکر آتا ہے۔ اس کے مسائل میں کچھ اور باتوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ غالب ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ دنیائے ادب کا ایک نادر ہنرمند شاعر ہے اگرچہ اس کے ابتدائی یا بعض اوقات کلام میں کہیں کہیں سستی بھی پائی جاتی ہے۔ جب وہ احساس کرتا ہے کہ ایک خیال مجھ سے بخوبی بیان نہ کیا گیا، تو پلٹ کر دوسرے انداز سے اسکو پھر کہہ دیتا ہے۔ فارسی میں یا اردو میں غزل میں یا مثنوی میں، قصیدے میں رباعی میں غرض کہیں نہ کہیں اس سلوٹ کو ستھرا کر دیتا ہے۔

اقبال نے ایک شاعر کے بارے میں کتنی صحیح اور درست بات کہی ہے جو اس پر بھی حاوی ہوتی ہے اور غالب پر بھی۔

کرم شب تابست شاعر در شبستان وجود
در پر و بالش فروغی گاہ ہست و گاہ نیست
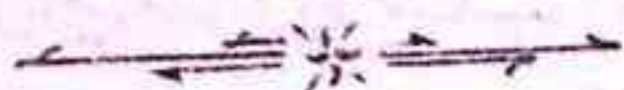
ایک شعر ترجمانی کے دو رخ

غالب کے شعر :

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

کی ایک شرح اور ایک انگریزی ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ شرح طباطبائی کی ہے جو بعض وقت غالب کے بے درد شارح سمجھے جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

" میں وہ دہقان ہوں جسکی سرگرمی خود اسی کے خرمن کے لئے برق کا کام کرتی ہے یعنے خرمن کو جلا ڈالتی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حرارت غریزی جو کہ باعث حیات ہے خود وہی ہر وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے۔ ہیولیٰ یعنی مادہ اور مصنف نے صورت کے لفظ ہیولیٰ کی مناسبت سے استعمال کیا ہے اور تعمیر سے تخمیر جسم خاکی مقصود ہے۔ خون گرم یعنی ہوئی سرگرمی "

دوسرا ایک انگریزی ترجمہ ہے محمد فرحت اللہ کا جو حیدرآباد میں سپرنٹنڈنگ انجنیر تھے لیکن ادب سے اور خاص طور غالب کی شاعری کے مطالعے کا ذوق رکھتے تھے انہوں نے جامعہ ملیہ دہلی میں بھی خدمت انجام دی۔ غالب کی غزلوں کا ترجمہ انہوں نے کیا تھا۔ اوپر کے شعر کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

Tiller's warm blood coursing, surety for till'd land The very electeri current in speed, yet in discharge, Dread lurks of lightning-stroke; so in my being fabric. On life's pattern, death-strands interowevren.

عبدالقادر سروری

یہ غزل فکر کی اپج، اور اظہار کے اسلوب کی ندرت کی وجہ سے غالب کی معرکتہ الآرا غزل مانی گئی ہے۔ اس کے ان کی ابتدائی دور کی غزل ہونے میں شبہ نہیں، اس میں مقطع کا نہ ہونا اس کی دلیل ہے۔ غالب کی غزل اور خاص طور پر جو غزلیں منتخب دیوان میں شامل ہیں، ان کا، فکر اور اسلوب کے علاوہ ترتیب اور تعمیر کا بھی ایک نقشہ (Pattern) ہے۔ ہر غزل میں عموماً مطلع اور مقطع دونوں موجود ہیں۔ بہت کم غزلیں ایسی ہیں، جن میں مطلع یا مقطع نہ ہو۔ لیکن نظری کی ہوئی غزلوں سے جو شعر منتخب کئے گئے ہیں، وہ اس نقشہ کو ملحوظ نہیں رکھتیں۔ اس طرح غالب کی یہ غزل کاٹ چھانٹ کی مورد بنی ہے۔ یہ اشعار جو منتخب دیوان میں شامل ہیں، انھیں غالب نے فکر اور اسلوب کے اعتبار سے نظری کئے جانے کے قابل نہیں سمجھا۔ اس لحاظ سے یہ اہمیت رکھتی ہے۔ نظری کی ہوئی غزلوں یا اشعار میں سے اکثر ایسے ہیں، جن میں ابلاغ اور ترسیل کے اعتبار سے ان کے زمانے کے عام غزل خواں اصحاب کے لئے کچھ نہ کچھ اشکال ضرور موجود تھی۔ اس غزل میں بھی تھوڑی سی گنجلک موجود ہے، لیکن اتنی نہیں کہ مفہوم ذرا غور اور توجہ کے ساتھ پڑھنے پر سمجھ میں نہ آئے۔

اس غزل میں، غالب کی بعض اور غزلوں کی طرح خیال کا تسلسل بظاہر موجود نہیں ہے، سوائے ایک شائبے کے جو قافیہ اور ردیف کا تقاضہ ہے اور یہ پڑھنے والوں کے ذہن کے پس منظر میں موڈ کا ایک تسلسل پیدا کر دیتا ہے، جس سے غزل سے حاصل ہونے والے ارتسامات میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہاں شاعر کی ذات فکر کا محور ہے اور وہ اپنی ذہنی اور نفسی واردا توں اور کیفیتوں کے کچھ نقوش نمایاں کر رہا ہے۔ اس طرح شاعر خود اس غزل کا پس منظر بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے! قافیہ اور ردیف کی یگانگت، دوسرے قابل ذکر شاعروں کی غزل میں بھی یہ خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی واقعات اور حوادث کا سلسلہ وار بیان، غزل کا فن نہیں، اس کے متلاشیوں کو غزل کے پاس آنا نہیں چاہیئے، بلکہ بیانیہ شاعری کی جو اصناف ہیں ان سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غزل میں نفسی اور ذہنی تاثرات یا حوادث کو ایک نتیجہ خیز نظام میں ترتیب دے کر پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ غزل میں اس طرح کی ترتیب اگر پیدا ہوتی ہے تو وہ موڈ کے پس منظر سے ہوتی ہے تاثرات کی ترتیب سے نہیں۔

پہلے شعر میں ایک خفقان زدہ کی ذہنی کیفیت پیش کی ہے، جو سایہ سے بلکہ خود اپنے سایہ سے بھی ڈرتا ہے۔ دل بہلانے کے لئے وہ باغ میں بھی جاتا ہے تو شاخ گل کا سایہ، اسے افعی نظر آتا ہے، جو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے، اور وہ اس سے بھاگتا ہے۔ یہ ایک ذہنی کیفیت ہے اور کسی ایسے شخص پر بھی طاری ہو سکتی ہے۔ جس کی امیدیں مسلسل پامال اور عزائم ناکام ہوتے رہے ہیں۔ اس کا

ایک علامتی نقشہ حالی نے اپنے اس شعر میں پیش کیا تھا :۔

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

باغ کی سیر بھی شاعر کے دل گرفتہ کی کشاد کا سبب نہیں بن سکتی۔ "باغ ڈراتا ہے" میں شاعرانہ تعلیل ہے، اور یہ خفقانی کا اپنا تاثر ہے، حالانکہ باغ فعال نہیں، بلکہ خفقانی کا ذہن اسے فعال سمجھتا ہے، اور یہ بھی خفقان کی علامت ہے۔ ڈرانا ایک متعدی اور ارادی فعل ہے جو باغ کے ساتھ فطرتاً منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر اس اسلوب سے خفقانی کے ذہن کے تاثر کو ظاہر کر کے موقع کو موثر بنا دیتا ہے۔ اس میں ایک حسین شائبہ یہ بھی موجود ہے کہ باغ یہ حرکت مزاحاً کرتا ہے، ایسے جیسے کسی ڈرنے والے بچے کی افتادِ طبع کو جانتے ہوئے کوئی بچہ کر سکتا ہے۔ ایک اور خوبی جس کے لئے دنیا کے اور دوروں میں شاعروں کی طرح غالب بھی امتیاز رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ غالب یہاں خفقانی کے شعوری تاثر ہی کو پیش نہیں کرتے بلکہ اس نفسیاتی مرقع کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ پس منظر میں خفقانی کے تحت شعور کی اس کیفیت کی طرف بھی اشارہ مہیا ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے خفقانی ہونے کا احساس ہے، جس کا اظہار "باغ پا کر خفقانی" سے ہوتا ہے۔ اس شعر کو وسیع تر چوکھٹے میں عالم اور اس کی کائنات کے بارے میں غالب کے عام عقیدے کا پرتو سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک توہم کا کارخانہ ہے، یہاں وہی ہے جو اعتبار کر لیا۔ ہمارا وہم "خفقان" ہے جو موہوم کو محسوس بنا دیتا ہے۔ اس پہلو سے شعر میں رمز اور علامات کی شرح طویل ہو جاتی ہے۔

دوسرے شعر میں بھی غالب کے مخصوص انداز فکر، ذہن کے پیچ در پیچ عمل اور اظہار کی انفرادیت کی ساری خصوصیات موجود ہیں، تاہم اس میں نظری کئے ہوئے اشعار کی طرح، ابلاغ کی کچھ اشکال نہیں۔ یہ شعر براہ راست ان کی اپنی ذات اور زندگی کے ایک پہلو اور ان کے رد عمل کو پیش کرتا ہے۔ مصائب شاعر کے ذہن کے لئے رکاوٹ کا باعث نہیں بن سکتے بلکہ ایک تازیانے کا کام کرتے ہیں۔ تیغ کے جوہر، تلوار کی آب، جو اسے ہلاکت کا ضامن بناتی ہے، اس کا منبع زہر آب ہے اور زہر آب کے علاوہ کوئی چیز اور نہیں ہو سکتی۔ زہر کے پانی میں بجھی ہوئی تلوار، جوہر دار ہوتی ہے، اس لئے سخت مہلک بھی۔ شاعر کی طبع کے جوہر کی آبیاری زہر آب، رنج والم اور ریاض سے ہوتی ہے۔ اس کی طبع کے جوہر کاٹ اور اثر میں زہر آب میں بجھی ہوئی تلوار کے مماثل ہیں۔ تلوار کے پھل کو شکل میں سبزہ کی پتی سے مشابہت ہے اور جب اس تلوار کے جوہر زہر آب سے نمو پاتے ہیں، تو اسے ایسا سبزہ سمجھنا چاہئے جس کی آبیاری زہر آب سے ہوئی ہے۔

غالب نے اسی خیال کو ایک اور جگہ اس طرح سے بھی پیش کیا ہے۔

"رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور"

ریاض اور محنت، شاعر کے فن کو نکھار دیتے ہیں، جیسا کہ اقبال نے کہا ہے:۔

معجزۂ فن کی ہے، خون جگر سے نمود

گویا شاعر کی طبعیت کے جوہر رنج و محن سے جلا پاتے ہیں۔ یہاں غالب نے دوسرے عظیم شاعروں کی طرح شعر میں بلاغت اور مقتضا سبب لفظو یکے تلازمہ کو بھی

ملحوظ رکھا ہے۔

تیسرا شعر بھی ذاتی واردات ہے۔ کوئی قوت ہے جو کشاں کشاں مجھے آئینہ خانے میں لئے جاتی ہے اور یہ آئینہ خانہ، اس کے شیشۂ دل کے ٹکڑوں سے زینت پایا ہے۔ اس آئینہ خانے میں اس لئے لے جایا جاتا ہے کہ مقاصد میں ناکامی، جس کے باعث شیشۂ دل چور چور ہو گیا ہے، اس کا تماشا کرے نزاکت میں، دل کو شیشہ سے مناسبت ہے اور جب یہ شیشہ ٹوٹا تو اس کے جتنے ٹکڑے ہو گئے، ان میں سے ہر ایک میں صورت نظر آنے لگتی ہے اور اس طرح ایک نگارخانہ تعمیر ہو جاتا ہے لیکن اس نگارخانے میں جو تماشا نظر آتا ہے، وہ مقاصد میں ناکامیوں کا۔ گویا تخریب سے ایک نئی تعمیر ہوئی، مقاصد کی تخریب ہوئی تو فکر کا ایک نگارخانہ تعمیر ہو گیا۔ "کوئی لئے جاتا ہے" میں شاعر لے جانے والے کا تعین نہ کر کے، شعر کے محمول کے لئے وسیع گنجائش پیدا کر دیتا ہے۔

چوتھے شعر میں فکر کی گہرائی اور عمومیت قابل توجہ ہے۔ اس عالم کا سرمایہ محض نالہ ہے اور بقول میر کے "نغمہ یا نالہ ہر ایک بات کا انداز ہے ایک" یہ نالہ یا نغمہ، صوت ہے، اور عالم نمود صور اور اظہار صوت پہ مشتمل ہے۔ جس طرح کائنات کی حرکت ایک عالمی "لے" (Rythm) میں منسلک ہے اس کی اصوات، ایک متوازن ترنم میں مربوط ہیں۔ اس خیال کو شعر کی قبا پہنانے کے لئے شاعر نے اظہار کے لوازم پیدا کئے ہیں۔ نالہ کے تصور کے ساتھ قمری ذہن میں آ جاتی ہے، جو خاکستر ہے، اور خاکستری رنگ کے بیضہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خاکستری رنگ کا بیضہ آسمان کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے، جس کی شکل بھی بیضوی ہے۔

اس اعتبار سے یہ عالم خاکداں کہ وہ نالہ کا مبدا ہے۔ شاعر کی نظر میں ایک بیضہ قمری دکھائی دینے لگتا ہے، جس سے نالہ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح اس خاکدانِ عالم کا سرمایہ شاعر کو نالہ کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیتا لیکن یہ نالہ وہی عالمی صوت ہے، جس کی لَے میں ساری کائنات بندھی ہوئی ہے۔ شاعر یہاں بھی الفاظ کے تلازمہ کے ذریعے شعر کے صوری اور بلاغت کے محاسن کو نظر انداز نہیں ہونے دیتا وہ اس بات کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ عالمِ ہست و بود کا ماحصل نالہ ہے جو علامت ہے رنج و محن کی اور اس دعویٰ کے ثبوت میں وہ قمری اور بیضہ قمری کے استعاروں سے مدد لیتا ہے۔ عالم کے ساتھ نالہ کا تصور غالب کے ذہن میں بار بار پیدا ہوا ہے۔

مثلاً: "جیسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے"۔

آخری شعر غالب کے لطیف اور حسین مزاج کا عمدہ نمونہ ہے۔ جب تک جیتا رہا، محبوب کی محفل میں بیٹھنے کی تمنا ہی رہی، جب کبھی اس محفل ناز میں گیا اور ان کی نظر پڑی، اٹھا دیا گیا اور بیک بینی و دوگوش وہاں سے چلتا کر دیا گیا۔ اس طرح اس محفل کے لئے سبزہ بیگانہ بنا رہا۔ آخر اس حیات ناکام کا بھی انجام آ پہنچا۔ مرنے کے بعد اب کون اٹھا سکتا ہے؟ یہاں "اٹھانا" میں ایہام ہے۔ ایک لفظی مفہوم اور ایک اصطلاحی مفہوم۔ محفل سے اٹھانا اور میت کو اٹھانا۔ پہلی صورت میں تو بارہا اٹھایا گیا، اب آخری صورت میں کون اٹھاتا ہے، میں ایک تو ترحم شاعرانہ ہے، کہ دیکھتا ہوں کہ اب اٹھانے کی مجال کس کو ہے۔ اور اس سے شاعر کی نامرادانہ زیست کی ایک ذہنی تلافی بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ خیال بھی پس منظر میں موجود ہے کہ دیکھنا ہے میری ناکامیاں کیا رنگ لاتی ہیں، اب

وہ میت کو اٹھانے پر تیار ہوتے ہیں یا نہیں۔ لیکن یہ سارا ایک استعارہ ہے، جو زندگی کے بارے میں غالب کے عام تصور کے مناسب ہے۔ زندگی کی محفل عیش میں بار تو کبھی نصیب نہ ہوا اور جب اس کا موقع تو بقول سعدی :

" دمے خوردہ بودند گفتند بس "

فلک سے عیش کا تقاضا ہی رہا۔ آخر موت نے ناکامیوں کے اس سلسلے کو انجام کو پہنچا دیا۔ اب دیکھیں وہاں اس کی کیا تلافی ہوتی ہے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

" اس سے پہلے غالب کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اب بھی لکھا جا رہا ہے اور شاید آئندہ بھی لکھا جائے۔ غالب کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ اس قدر تحقیق و تنقید کے بعد بھی "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"۔ نئے نئے پہلو روز سامنے آتے رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں غالب کے بہت سے بُت بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ مگر موضوع ابھی فرسودہ نہیں ہے۔ اس میں ایک ابدی تازگی ہے، ایک ترشے ہوئے ہیرے کی طرح اس میں سینکڑوں پہلو ہیں۔ "

(آل احمد سرور)

شری پرتھوی چندر
مرتبہ "مرقع غالب"

غالبؔ کی قدر میری نظر میں

جب سے دنیا قائم ہوئی ہے اُس وقت سے لیکر اب تک ہر دور میں ایسی عظیم الشان ہستیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں جو اپنے اعلیٰ ادبی خدمات اور درخشاں کارناموں کی وجہ سے زندہ جاوید بن گئی ہیں۔ اور آنے والی نسلیں ہمیشہ انکے کارناموں پر فخر کے ساتھ عقیدت کے پھول نچھاور کرتی رہیں گی۔ ایسی ہی ایک ممتاز ہستی دنیائے ادب میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی بھی تھی۔ غالبؔ نے چمنستان شاعری میں ایسے سدا بہار پھول کھلائے ہیں جنکی خوشبو ابھی تک تازہ ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ مرزا غالب سے جو ملتا وارفتہ ہو جاتا تھا اور بار بار ملنے کا اشتیاق رکھتا حتیٰ کہ نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور کو مرزا غالب سے ملنے کا اسقدر اشتیاق تھا کہ یکے بعد دیگرے پانچ مراسلے بھیجے۔ لکھتے ہیں مشفقا چونکہ مخلص کو اشتیاق حصول معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجہ کمال ہے اور آپ تشریف آوری اس جگہ مناسب ہے اسی واسطے حوالہ خامہ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ اب دیدار فائض الانوار اپنے سے مخلص کو مسرور فرمایا جائیے پھر دوبارہ مراسلہ بھیجتے ہیں حال تشریف آوری آپ کا اس طرف کو ابھی تک سامعہ نواز نہیں ہوا اور

دل صفا منزل اور اشتیاق منتظر دریافت سرور ملاقات کا ہے۔ اسی واسطے حوالہ خامہ اتحاد نگار کے ہوتا ہے تاکہ آپ براہ عنایت کے نوید تشریف فرمائی اس سمت سے کہ کب تک ممکن الوقوع ہے۔ مطلع اور مطمئن فرمائے اس طرح ایک قصیدہ جو مرزا غالب نے نواب صاحب کو بھیجا اس کے جواب میں یوں لکھتے ہیں کہ حقا کہ اللہ تعالے نے آپ کو بے نظیر پیدا کیا ہے جس کمال کو دیکھئے اسی میں آپ کی ذات فرد کامل ہے آپ کا مراسلہ ہمیشہ نقل محفل رہتا ہے جو سنتا ہے جو دیکھتا ہے وارفتہ ہو جاتا ہے سچ ہے ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں برس فلک چرخ لگاتا ہے تب کہیں ایک شخص کمال کا پیدا ہوتا ہے اللہ تعالے طول عمر عطا کرے اور تا دیر اہل جہاں آپ کی ذات سے مستفید ہوا کریں"۔ مرزا غالب نے ایک دفعہ جو قصیدہ لارڈ ریڈنگ کو فتح پنجاب پر بھیجا اس میں اپنا تعارف یوں کراتے ہیں۔ میں اپنا تعارف کیا کراؤں یوں تو میں شاعری کا شغل رکھتا ہوں لیکن میرے آبا کا پیشہ عملی دنیا میں ہی تھا میرا خاندان افراسیاب سے ملتا ہے اُس وقت سے لیکر میرے والد کے عہد تک شاہی سپاہ سے تعلق رہا ہے اور یہی طریقہ انکی اولاد کا بھی تھا۔ اگر میں پشت در پشت اپنا نسب نامہ صوفیانہ انداز میں بیان کروں تو آپ سب ہی کو بہادر ہی پائیں گے میں ہی وہ ہوں جس کو خود اعتمادی ہے اور اس اجڑی دنیا میں پروردگار عالم کے فضل سے شاعری کی دنیا کا بادشاہ ہوں اور قلم ہی سے تلوار کا کام لیتا ہوں میرا یہ کلام صاحب نظر لوگوں کو نہایت عمدہ اور مرغوب خاطر ہے۔ عقل کے تقاضوں نے مجھے دنیائے شاعری میں غالب نام دیا ہے اور اسی نام سے فرشتوں کے ہاں بھی مشہور ہوں۔ میرا قلم جو لکھتا ہے وہ

نوائے سروش ہے۔

ع — آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

مگر مرزا کو زندگی بھر میں یہی افسوس رہا کہ انکے کلام کو سمجھنے والا کوئی نہ ملا اور کچھ قدر ہوئی بھی تو بیرزال کی سی جو ایک سوت کی انٹی لیکر مصر کے بازار میں حضرت یوسف کو خریدنے گئی تھی۔ غالب اپنے کلام کے متعلق درفش کاویانی میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ "روح سخن کی جستجو میں میری عمر کے باون برس کا گذر چکے ہیں اور اب میری چھیاسٹھ برس کی عمر ہو چکی ہے میں اس نعمت کلام عطا کرنے والے خداوند کریم کا شکر گذار ہوں کہ کمالات حسن سے نوازنے والے مالک نے ان باون برسوں میں مجھ پر کیسے اعلیٰ خیالات اور معنویت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور میرے فکر و خیال کی کرسی کو معرفت و آگاہی کی کس بلندی پر جگہ دی ہے وہ بیان نہیں کر سکتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرے دور کے لوگوں نے میری شاعرانہ خوبیوں کو نہیں پہنچانا ایسے لوگوں کی کج فہمی اور کوتاہی نظر سے میرا دل جل رہا ہے۔ نظر کو جلا بخشنے والے کمالات جن کو میں نے اپنی نظم و نثر میں صرف کیا ہے ان کی خوبیوں کو دیکھکر یہ لوگ پیچ و تاب میں پڑ گئے ہیں۔"

نواب علاؤالدین کو ایک خط میں یوں لکھا "مجھے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازہ بائستہ پائی نہیں۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا بقول

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے — مگر اک شعر کا انداز رسا رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا — آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب نے نئی زبان پیدا کی ادب کو نیا لب و لہجہ اور انداز بیان دیا۔ شوخی و ظرافت خود داری و خود اعتمادی مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی جس عنوان پر قلم اٹھایا نیا راستہ بنا لیا۔ غزلیات، قصاید، مثنویات سب میں جو رنگینیاں پیدا کیں ان کا جواب نہیں۔ مکاتیب غالب کیا ہیں ایک تاریخ کا منظر ہے۔ شوخی و ظرافت سنجیدہ و مزاحیہ تحریر ہر ایک پر ان کا قابو پائیں گے۔ اور تو اور خدا سے بھی ہمکلام ہوتے ہیں تو سوال کا جواب چاہتے ہیں جیسے کہ مثنوی گہر بار میں گفتگو کی ہے۔ اردو شعر:

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

زاہد سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ میں نے جو ایک انگور کا خوشہ دیا اسے کم نہ سمجھ ایک پورے جام شراب کا نقصان کیا ہے۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے کہ مومن اور کافر کس بات پر لڑتے ہیں۔ مومن کے پاس فقر تسبیح اور مسواک اور کافر کے پاس قشقہ اور زنار ہے۔" میں نے غالب کی جاگیر کے معاملے پر ایک کتابچہ جاگیر غالب کے نام سے مرتب کیا ہے۔ جس کو آپ نمائش کے اندر ملاحظہ فرما سکیں گے۔ جب مرزا غالب کو اپنی پنشن کی غلط تقسیم کا خیال دماغ میں جم گیا تو خیال ہوا کہ کلکتہ میں نواب احمد بخش خاں کے خلاف اپنا حق لینے کی خاطر چارہ جوئی کرنی چاہیئے مگر بیشتر اس کے کہ

کوئی قدم اٹھاتے دوستوں کے مشورہ پر کہ پہلے نواب موصوف کے پاس لوہارو جاکر ہر چند منت سماجت کی مگر نواب کی طرف سے سوائے زبانی تسلیوں کے اور کچھ حاصل نہ ہوا تو غالب نہایت غم زدہ ہو کر علی بخش خاں کو یوں لکھتے ہیں "نواب سے وابستہ امیدوں کے ساتھ میں نے بہت کچھ ساز کیا اور آتش انتظار کی گرمی سے پگھلتا رہا ایسے عذاب میں مبتلا ہوں جیسے قیدی قید خانہ میں اور دیکھ رہا ہوں جو ایک کافر کو جہنم میں دیکھنے کو ملے گا فیروز پور میں اسی لئے نہ آیا تھا کہ دہلی کے لوگوں نے نواب کی زبانی نوازش سے مجھے فریب دیا۔ کب تک صبر کروں اور کچھ نہ ہونے پر اپنے دل کو خوش رکھوں۔ شاہ جہاں آباد کے در و دیوار سے بلائیں برستی ہیں۔ دوست کہتے تھے کہ تم نواب کے پاس نہیں جاتے اور درد دل ان سے نہیں کہتے ورنہ یہ کب ہو سکتا ہے "نواب صاحب کی طرف سے چارہ سازی نہ ہو۔ اب جو کچھ کہہ رہا ہوں ان ادا ناشناسوں کی خاطر سے کر رہا ہوں۔ خدا کے لئے ایسی بنیاد قائم کرو کہ میرا [illegible] جلد واپس آجائے تاکہ میں نصیحت کرنے والے دوستوں کو خیرباد کہدوں اور بے سروسامانی کے ساتھ کلکتہ روانہ ہو جاؤں"۔ چنانچہ مرزا غالب کانپور لکھنو باندہ فرخ آباد، بنارس، پٹنہ سے ہوتے ہوئے کلکتہ پہونچے۔ جو حضرات مرزا غالب کا ان کے ہمعصروں سے موازنہ کرتے ہیں وہ کوئی شائستہ ادبی خدمت انجام نہیں دیتے بلکہ ان کے کلام میں رخنہ پیدا کرتے ہیں۔ اور ان عالم ہستیوں کی عزت کو گھٹاتے ہیں مقابلہ کرنے میں ان کی خوبیاں اور اوصاف مدھم پڑ جاتے ہیں۔ ان کی مثال یوں سمجھئے کہ ستاروں کی روشنی مہتاب کی روشنی، سورج کی روشنی اپنی اپنی جگہ پر ایک روشنی درخشندہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان روشنیوں کا مقابلہ

کرنے لگے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ ستارے، چاند اور سورج اپنی اپنی جگہ پہ ہیں اور
یہی فرق کلام غالب میں اور ان کے ہمعصروں میں ہے۔ مقابلہ ہمیشہ یکساں چیزوں کا
ہونا چاہیئے ان کے ہمعصر بے شک بلند پایہ کے شاعر تھے اور ان کے کلام میں رفعت
خیال اور عمدہ مضمون موجود ہیں لیکن اپنی اپنی جگہ پہ زمین و آسمان کا فرق
مرزا غالب کے کلام اور ان کے ہمعصروں کے کلام میں ہے مرزا غالب کے تخیل
کے پرواز جہاں پہنچتی ہے وہاں دوسرے شعراء کا گذر نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ
مولانا محمد حسین آزاد حضرت ذوق کے شاگرد رشید تھے۔ اس لئے غالب کے مقابلہ
میں انہیں بڑھانے چڑھانے کی کوشش کی اور جب تک زندہ تھے آپ نے کلام
غالب کو چمکنے نہ دیا۔ باوجود ایسا کرنے کے بھی ذوق کے کلام کے کتنے شائقین پیدا کر سکے
آخر آزاد نے بھی غالب کی عظمت اور برتری کو تسلیم کیا۔ اور یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے
کہ یہ وہ موجودہ منتخب دیوان غالب ہے جس کو ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے
پھرتے ہیں۔

میں نے ان چند الفاظ میں غالب کی عظمت کے بارے میں کچھ اشارے کئے ہیں۔
اور یہ بات دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ غالب قدرت کی طرف سے عجیب و غریب دماغ
لے کر آئے تھے۔ ان کا راستہ عام شاعروں سے الگ تھا۔ اپنی قوت اختراع و
ایجاد سے انہوں نے گلستان شاعری کو نئے نئے خوشبودار پھولوں سے آراستہ
کیا۔ ان کی شاعری میں نازک خیالی ملے گی۔ بھائی یوسف مرزا کا دیوانہ ہو جانا
اور ان کی موت ادبی ہنگامہ قاطع برہان کا جھگڑا، پنشن کا بند ہو جانا دوستوں اور
شاگردوں کا غدر میں قتل ہونا یہ سب باتیں ایسی تھیں جنہوں نے مرزا غالب کو تمام عمر

پریشان اور متفکر رکھا۔ مگر باوجود یہ سب کچھ ہونے کے وہ نہایت ہی پامردی و استقلال اور بے خوفی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور پھر اس پریشانی کی حالت میں بھی انھوں نے نظم و نثر میں وہ نام پیدا کیا کہ جس کے آگے ان کے ہمعصر اور دوسرے شعرا سرنگوں ہو گئے اور کلام غالب نے سب کو مغلوب کر لیا۔ اپنی رفعتِ تخیل کا وہ کمال دکھایا جو آج تک اردو کے کسی شاعر سے نہ ہو سکا۔ سب سے بڑھ کر حضرت غالب کو یہ کمال قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں اتنے بڑے شاعر بھی ہوئے اور نثر نگار بھی۔ اگر مرزا غالب کو اطمینان اور سکون میسر ہوتا اور پریشانیاں لاحق نہ ہوتیں تو معلوم وہ کتنا بیش بہا علمی اور ادبی وغیرہ ہمارے لئے چھوڑ جاتے اور اب بھی جو کچھ ادبی گنجینہ ہم سب کے لئے چھوڑا ہے وہ بھی کم باعث فخر نہیں ہے۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شاعر ان کے کمالات کے آگے اپنا سر عقیدت جھکاتے ہیں اور ہم اُن کی ذات پر فخر کرتے ہیں۔ مرزا غالب کی بلاغتِ کلام ہی نے اِن کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ غالب نے صحیح لکھا ہے کہ میری گرمی پرواز کا یہ عالم ہے کہ پر و بال کا سایہ بھی دھوئیں کی طرح بالا ہی بالا چلا جاتا ہے اور میرے سایہ تک بھی کوئی نہیں پہنچا شعرا خود کوشش کر کے فن شعر تک پہنچتے ہیں اور میرے ہاں خود فن شعر آ پہنچا ہے۔ گو خزینہ دعقل و علم دونوں چیزیں ہیں مجھے خزینہ زر و نہ کا کوئی مضائقہ نہیں دوسری چیز تو مجھے دی گئی ہے۔ دنیا نے اس کی قدر نہ کی اس میں سایہ مرا کیا قصور میرے کلام کی بلندی اس قدر ہے کہ دنیا کے آدمی دیکھیں گے تو میری نظم کو آب حیات اور نثر کو نسخہ اعجاز قرار دیں گے۔

غالب کی عظمت کے اسباب

کسی شاعر کے کلام کی عظمت کو جانچنے کا انحصار کئی باتوں پر ہوتا ہے۔ سب سے پہلی چیز شاعر کے عہد کی ادبی فضا ہے۔ یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ شاعر نے اپنے عہد کی ادبی فضا سے کس طرح استفادہ کیا اور اپنے معاصر شعراء میں اُس نے کیا مقام حاصل کیا۔

دوسری چیز جو دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کے کلام میں عظمت کے کیا عناصر موجود ہیں۔ یعنی شاعر کے خیالات اور تصورات کس پایہ کے ہیں۔ اور ان خیالات اور تصورات کو ظاہر کرنے کے لئے جو اظہار کے سانچے اور اسالیب اس نے استعمال کئے ہیں وہ کیسے ہیں۔ سب سے آخر میں یہ بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے بعد آنے والے شعراء کی کیا رہنمائی کی اور ان پر کیا اثر ڈالا۔

جہاں تک اپنے عہد کے اثرات کو قبول کرنے کا تعلق ہے جب ہم غالب کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو یہ دکھائی دیتا ہے کہ غالب ایسے زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب غزل کی شاعری اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ غزل کی تکنیک، اسکے روپ، اُس کے موضوعات اور اسالیب متعین ہو چکے تھے۔ اور ان میں کافی ارتقاء بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے سربرآوردہ شعراء میں

ذوقؔ اور مومنؔ بلند پایہ کے شاعر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ذوقؔ کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل تھا کہ وہ بادشاہِ وقت کے استاد مقرر ہوئے تھے۔ مومنؔ کی فکر میں گہرائی اور گیرائی اور اسالیب میں ندرت بھی تھی۔ اس فضا میں، غالبؔ اس وقت تک نہیں چمک سکتے تھے جب تک کہ وہ اپنا ایک انداز شاعری لیکر نہ اٹھتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غالبؔ باوجود اس کے کہ وہ غزل گو شاعر تھے اور غزل ایک پٹی ہوئی صنف بن گئی تھی، ان کی فکر کی اُپج نے قدیم روایات ہی کی بنیادوں پر اس کی نئی تعمیر کی اور اس طرح اس میں ایک انفرادیت پیدا کر دی نتیجتاً غزل کا پایہ اس سے بہت زیادہ اونچا ہو گیا جس مرحلے میں وہ انھیں ملی تھی۔ حالیؔ نے غالبؔ کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ایک اہم بات یہ لکھی ہے کہ غالبؔ نے اپنی طبیعت کی جدت سے غزل میں ایک نیا راستہ نکال لیا تھا اور جو غزل کی عام خصوصیتوں کے لحاظ سے ان سے مشابہ ہوتے ہوئے بھی ان سے مختلف اور متوازی تھا۔

غالبؔ کے معاصر ذوقؔ کی غزل کا بڑا کمال ان کی محاورہ بندی اور روزمرہ کے استعمال میں ہے۔ جہاں تک خیالات اور تصورات کا تعلق ہے وہ کھوکھلی ہے۔ اس لئے ذوقؔ کی شاعری کو ان کے بعد وہ مقبولیت نہ رہی جو غالبؔ کی شاعری کو حاصل ہے۔ بعض وقت ذوقؔ کی غزلیہ شاعری صاحب نظر اور صاحبِ ذوق پڑھنے والوں پر اپنی عوام پسندی کی وجہ سے گراں گذرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے استاد ہونے کی وجہ سے ان کو اپنے زمانے میں عزت اور احترام کا مقام حاصل رہا لیکن جہاں تک خیال کی اُپج اور اسلوب کے حسن کا تعلق ہے اس میں وہ کوئی اہم اضافہ نہیں کر سکے اپنے انداز کی عام پسندی کی وجہ سے وہ عوام میں مقبول ضرور ہو گئے تھے۔

حکیم مومن خاں مومن کی طبیعت میں بھی بڑے جوہر پوشیدہ تھے لیکن انکی فکر زیادہ تر شعر میں اشکال پیدا کرنے کی طرف مائل تھی۔ کہیں کہیں ان کے ہاں اچھے شعر ہیں جو خیال اور اسلوب دونوں لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان کے یہاں ایسے اشعار بہت کم ہیں جو پڑھنے والوں کے ذہن میں احساس حسن اور لطافت کو متحرک کر سکیں۔

غالب کی شاعری میں ان دونوں اساتذہ کے مقابلے میں بلکہ ان کے پہلے اور بعد کے اکثر شعراء کے مقابلہ میں کچھ خصوصیتیں ایسی جمع ہو گئی ہیں جو ان کے کلام کو انفرادیت بخشتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ان کے سوچنے کا انداز بالکل نیا ہے۔ جیسا کہ حالی نے لکھا ہے کہ اگر ہم دوسرے شعراء کے کلام کو پڑھنے کے بعد غالب کی شاعری کا مطالعہ کریں تو اس میں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ غالب کے ہاں کچھ خیالات ایسے ملتے جو الہامی معلوم ہوتے ہیں اور انہیں کی فکر و نظر کا نتیجہ دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے خیالات جو ان سے پہلے کے شعرا باندھ گئے ہیں جب غالب کی فکر سے مس ہوتے ہیں، تو ان میں ندرت پیدا ہو جاتی ہے بعض موضوعات غالب کی شاعری کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں اور دوسرے شعراء کے کلام میں اس انداز میں پیش نہیں ہوئے ہیں جس انداز میں غالب نے انہیں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ان کے صوفیانہ افکار کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں۔ غالب نے تصوف کے خیالات کو دوسرے شعراء کی طرح محض "برائے شعر گفتن خوب" سمجھ کر یا شعر میں حسن پیدا کرنے کے لئے نہیں باندھے بلکہ وہ اپنے مخصوص صوفیانہ رجحانات کے تحت ایسے اشعار کہتے

ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو منظور تنک ظرفی منصور نہیں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالب کو اپنی شاعری کے اس پہلو کا احساس تھا اور اس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا تھا:۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کی شاعری کے حسن میں ان کے خمریات کے مضامین باندھنے کے اپنے مخصوص انداز کا بھی بڑا حصہ ہے۔ خمریات اردو اور فارسی کے بہت سے شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے اور تقریباً ہر شاعر کے یہاں شراب، ساقی، میکدہ اور اس کے متعلقات کا ذکر ملتا ہے لیکن غالب کے خمری موضوعات میں جو کیف ملتا ہے وہ بہت کم شاعروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انکے یہ شعر:۔

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

یا

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

غالب کی شاعری میں شراب اور کیف و مستی کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے وہ انہی کا حصہ ہو کر رہ گیا ہے۔

غالب کی شاعری کی حقیقی عظمت دراصل ان کی حقائق فطرت اور نفسیات انسانی کے بعض پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کرنے میں بھی ہے۔ مثلاً ان کا یہ مشہور شعر:

ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

بعض شارحین کی نظر میں مسئلہ استحالہ عناصر کی توضیح ہے۔ انسانی نفسیات کے بعض پوشیدہ گوشوں پر غالب نے جس انداز سے روشنی ڈالی ہے اس کی مثال اردو غزل میں بہت کم ملتی ہے۔ چنانچہ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں — بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک — مجھ کو دیتا ہے پیام وعدہ دیدار دوست

غالب کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت تھی۔ وہ نہ صرف شعر و سخن میں اونچا مقام رکھتے تھے بلکہ نثر میں بھی وہ اپنا ایک انفرادی اسلوب رکھتے تھے جو ان کے خطوط میں ظاہر ہوا ہے۔ ان کی خطوط نویسی میں اتنی انفرادیت تھی کہ خود ان کے چہیتے شاگرد میر مہدی مجروح نے بھی ان کا اتباع کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ غالب نے خطوط نویسی کے اگلے اسلوب کو یک لخت ترک کر دیا تھا اور ایک نقاد کے قول کے مطابق مکاتبے کو مطالعہ بنا دیا تھا۔ خط ایسے لکھتے تھے گویا دو آدمی آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے انداز میں بیان کا حسن بھی ہے اور پیش کشی کی ڈرامائیت بھی۔

صحیح ہے کہ غالب اپنے زمانے میں اپنی بیگانہ روی کی وجہ سے مقبول

نہ ہو سکے لیکن جیسا جیسا زمانہ گذرتا جارہا ہے ان کی قدر میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ان کے اپنے زمانے میں بھی میر مہدی مجروح اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اُن سے بہت متاثر رہے۔ حالی جنہوں نے اردو شاعری کے نہج کو بدلنے میں کارنمایاں انجام دیے تھے اُن کے انداز فکر سے بہرہ حاصل کیا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

غالب کی شاعری کا جو اثر اُن کے بعد کے عظیم شعراء پر ہوا اس کی ایک جیتی جاگتی مثال علامہ اقبال ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ابتدائی دور میں اقبال نے بعض غزلیں غالب کے انداز میں لکھی ہیں غالب کی فکر کا اثر ان کے ذہن کے رگ و ریشے میں سرائیت کر گیا تھا۔ ان کی لفظیات اور ترکیبوں کی بنیاد غالب کے اسلوب کے مخصوص نہج پر ہے۔

سب سے آخر میں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ غالب نے اردو نثر اور شاعری کو جتنا متاثر کیا کسی اور شاعر نے نہیں کیا۔ ان کی ترکیب تراشی کا انداز ان کے بعد ایسا عام ہو گیا کہ اکثر شعرا کے یہاں اسی انداز میں ترکیبیں وضع کی گئی ہیں۔ خود ان کی ترکیبیں مثلاً داماں باغباں، کف گلفروش، جنت نگاہ، فردوس گوش وغیرہ اردو ادب کا سرمایہ امتیازہ بن گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اکثر اشعار اپنے مصرف کی عمومیت کی وجہ سے زبان زد خاص عام ہو گئی ہیں اور ان میں سے بعض اشعار ضرب المثل بھی بن گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا | لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی | اب کسی بات پر نہیں آتی

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

حالی کا مرثیۂ غالب

اقتباس

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات | جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس | پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج | رند اور مرجعِ کرام و ثقات
لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول | سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل | دن کو کہتا تھا دن اور رات کو رات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا | قلم اس کا تھا اور اس کی دوات
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں | لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

مرزا محمود بیگ

زندگی اس رنگ سے گذری

تین رُخ

جناب ام۔ ام۔ بیگ صاحب کا یہ ڈراما جو غالب کی زندگی کے تین رخ کو پیش کرتا ہے۔ صد سالہ برسی کے موقع پر گورنمنٹ ویمنز کالج سرینگر کی طالبات نے اسٹیج پر پیش کیا تھا۔

راوی :۔

نجم الدولہ۔ دبیر الملک۔ نظام جنگ مرزا اسد اللہ خاں غالب کلاں محل آگرہ میں ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء مطابق ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی رات میں پیدا ہوئے۔ اور دلّی میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کو دوپہر ڈھلے انتقال کیا۔ ان کا سلسلہ نسب ترسم خاں سمرقندی سے چل کر ظفر بیگ سلجوقی اور افراسیاب سے ملتا ہوا فور ابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ خاندانی شرافت اور نجابت کے ساتھ ساتھ قدرت نے طبیعت بھی ایسی دی تھی کہ باوجود مصیبتوں کے ہار نہ مانی اور مرتے دم تک نہ صرف حوادث زمانہ کا مقابلہ کرتے رہے

بلکہ شعر و سخن کی دنیا کو اس طرح مالا مال کیا کہ آج تک استادانِ سخن میں ہی نہیں، بلکہ تاجدارانِ سخن میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

پانچ برس کے تھے کہ والد عبداللہ بیگ الور میں مارے گئے۔ نو برس کے تھے کہ چچا نصر اللہ بیگ بھی اُٹھ گئے۔ ابھی ۱۳ برس کے تھے کہ نواب احمد بخش خاں والی لوہارو کے بھائی الٰہی بخش خاں معروف کی گیارہ برس کی بیٹی امراؤ بیگم سے شادی ہو گئی۔ یا بقول غالب تیرہ برس حوالات میں رہنے کے بعد تا حیات قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ بیوی کی شکل میں بیڑیاں پہنائی گئیں۔ دہلی کو جیل قرار دیا گیا اور شعر و سخن کی خدمت مشقت تجویز ہوئی۔

غالب ۱۸۱۲ء میں دلی آئے اور پھر یہیں رہے۔ اس عرصہ میں مغلوں کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر بادشاہ کی ملازمت اور پھر استادی کی۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب دیکھا۔ عزیزوں کی موت کے رنج اٹھائے۔ دوستوں کی پھانسیوں کے چرکے کھائے اور زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے تیر اُن پر چلائے۔ مگر اس کے باوجود ان کا دل ایک ایسا جام جہاں نما بنا رہا جس میں ایک ہی نقش ہمیشہ نظر نہیں آتا بلکہ اس میں فطرت کے تمام نقوش باری باری سے نمایاں ہیں۔

اس ساز میں بے شمار نغمے ہیں اور ہر نغمہ دل آویز ہے۔ ان کے کلام میں سب کچھ ہے۔ اگر آپ دل لگی اور شوخی و ظرافت کا سامان

چاہتے ہیں۔ تو یہاں خیال آفرینی اور شوخ نگاری کی پھلجھڑیاں ہیں، اگر آپ شباب کی رنگین داستان اور حسن و عشق کے افسانے سننا چاہتے ہیں تو یہاں وہ سوز و گداز اور رنگ و مستی کی باتیں ہوں گی جن سے مردہ دلوں میں جان پڑ جائے۔ اور اگر آپ زندگی کے رازہائے پنہاں کی پردہ کشائی چاہتے ہیں تو غالب کی پختہ کارہستی آپ کو ایک سر بفلک بلندی پر لے جا کر اس کارگاہ ہستی کی سیر کرائے گی جہاں سے اس عالم کون و مکان کی ایک ایک چیز صاف نظر آئے گی۔

آیئے پہلے نوجوان غالب سے ملاقات کریں جو اپنے یار باش دوستوں کے لئے مرزا نوشہ ہیں۔

آگرہ کی پیپل منڈی میں دو نوجوان منشی بنسی دھر اور بنارس والے راجہ چیت سنگھ کے لڑکے راجہ بلوان سنگھ کشمیرن والے کٹرے، گڈریوں والے کٹڑے، سلیم شاہ کے تکیہ اور کھٹیا والی حویلی سے گذر کر غالب کے نانا خواجہ مرزا غلام حسین کمیدان کی حویلی کلاں محل کے دروازے پر پہونچے جس کے اوپر سنگین بارہ دری میں مرزا نوشہ کی نشست ہے۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

بنسی دھر اور بلوان سنگھ :۔ (مل کر) "نوشے" اے میاں نوشے"

بنسی دھر: ذرا زور سے آواز دو۔ ابھی نواب صاحب سو رہے ہوں گے۔

بلوان سنگھ :۔ سو رہے ہوں گے۔ دن کے بارہ بجا چاہتے ہیں۔ اور سو رہے ہوں گے۔

بنسی دھر :۔ کیوں انجان بنتے ہو۔ یاد ہے مجرے کی محفل، صبح ہوتے ختم
ہوئی تھی۔

بلوان سنگھ : ہوا کرے آخر ہم تم دونوں بھی صبح سویرے ٹھیک ساڑھے دس بجے
اُٹھ گئے تھے۔ یہ مرزا نوشہ اب تک کیوں سو رہے ہیں۔ (دروازہ زور سے کھٹکھٹاتے
ہوئے) "نوشے ارے میاں نوشے"

غالب :۔ (اوپر بارہ دری سے) کیا دروازہ توڑ ڈالو گے۔ بلوان ٹھیریئے نا۔
داروغہ جی دروازہ کھول رہے ہیں۔ ذرا سانس تو لو۔
(بہت بڑے دروازے کی اپنی چولوں پر گھومنے کی آواز)

داروغہ :۔ آئیے حضور۔ چھوٹے سرکار اوپر ہیں۔

بنسی دھر :۔ ان کے درشن تو باہر ہی سے ہو گئے تھے۔ یہ زینے کے کواڑ تو کھولو۔
تمہارے چھوٹے سرکار سات قفلوں میں کب سے رہنے لگے۔

داروغہ :۔ حضور رات کی نیند پوری کرنی ہوتی ہے۔ کسی کو اوپر جانے کی اجازت
نہیں۔ (زینے پر سے کسی کے اترنے کی آواز)
لیجیے چھوٹے سرکار خود ہی تشریف لے آئے۔

غالب :۔ لو اب اوپر چلو۔ یہاں کب تک سوال و جواب کرتے رہو گے۔

بلوان سنگھ :۔ اوپر کچھ پینے پلانے کو بھی ہے یا خالی خولی باتیں ہیں۔

غالب :۔ (چپکے سے) اے میاں یہ باتیں یہاں کہنے کی نہیں ہیں۔ تم چلو تو سہی
سب کچھ ہے۔
(تینوں کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز)

غالب :- (ذرا سانس لیتے ہوئے) بو بو شطرنج ہو گی یا چوسر۔ نیند تو میری بھی بھر چکی ہے اور تم دونوں بھی تازہ دم معلوم ہوتے ہو۔

بنسی دھر :- مرزا سچ پوچھو تو رات کے بے تکے گانوں سے اب تک منہ کا ذائقہ خراب سا ہے۔ اس وقت تو تمہارا کلام سننے آئے ہیں۔

بلونت سنگھ :- اور کلام بھی وہی۔ جیسے۔ مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس"

غالب :- تمہیں بھی پسند ہے اور مجھے بھی پسند ہے مگر چار شعر سناؤں گا۔

بنسی دھر :- چلو چار ہی سہی۔

غالب :- (خود اپنے کلام کا لطف لیتے ہوئے دلفریب ترنم سے)

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

بنسی دھر :- واہ واہ مرزا کیا شعر ہوا ہے۔

بلوان سنگھ :- طبیعت پھڑک اٹھی۔

غالب :- دیکھو بھئی طبیعت کو قابو میں رکھنا۔ بس دو اور سن لو۔

بلوان سنگھ :- طبیعت بے قابو نہیں تھی۔ محض ذرا۔۔۔۔۔۔۔

بنسی دھر :- ہاں محض ذرا آپ چپ رہئے۔ ہاں مرزا۔

غالب :- اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

بلوان سنگھ : واقعی فرصت ہو اور تصورِ جاناں ہو۔ خوب کہا مرزا خوب کہا۔

بنسی دھر :۔ شعر اچھے کہنے لگے ہو مرزا۔ باپ دادا کا نام خوب روشن کروگے۔

غالب :۔ جانتے ہو۔ افراسیاب کی نسل سے ہوں۔ اسلاف میرے تلوار چلاتے تھے۔ اب ان کا تیر ٹوٹ کر میرا قلم بن گیا ہے مگر:

عشق نے غالب نکما کر دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بلوان سنگھ :۔ اب بھی بہت کام کے ہو مرزا۔ خود ہی تو کہتے ہو:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

بنسی دھر :۔ (ایک کاغذ ہلاتے ہوئے) اور یہ درد لا دوا کے دوا کا نسخہ بھی دیکھا ہے۔

بلوان سنگھ :۔ وہ درد لا دوا ہی کیا جس کی دوا ہو۔ مگر اس کاغذ پر شعر لکھے معلوم ہوتے ہیں۔

غالب :۔ ہاں ہاں شعر ہیں۔ بس بس۔ اسے رہنے دو۔

بنسی دھر :۔ رہنے دوں۔ (بنا بنا کر پڑھتا ہے)

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

بلوان سنگھ :۔ واہ واہ! کیا خوب چیز ہاتھ لگی ہے۔ ذرا اور سناؤ۔

بنسی دھر : کیوں میری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

بلوان سنگھ : خوب مرزا نوشے ۔ تم تو چھپے رستم نکلے ۔ آخر ہم بھی تو جانیں کیا واردات تھی ۔

غالب :۔ (بہت ہی مایوسانہ انداز میں) اس زخم کو نہ چھیڑو بلوان ۔ تھی تو ستم پیشہ ڈومنی مگر میں اس کا مرنا کبھی نہ بھولوں گا ۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

وقفہ

راوی :۔ یہ تھیں جوانی کی محفلیں ۔ مگر رندی اور سیہ مستی کی گھنگھور گھٹائیں جلدی ہی موسلا دھار برس کے کھل گئیں ۔ البتہ اس زمانے کے ایک ساتھی کو مرتے دم تک نہ چھوڑا اور وہ تھی شراب ۔ شادی کے دو برس بعد مرزا غالب آگرے سے دلی آئے سخن سنج احباب استادانِ سخن کی صحبت اور خود اپنی طبیعت کی روانی نے کلام کو ترقی دی ۔ مگر پنشن کے جھگڑوں اور کلکتے کے سفر نے مالی پریشانیاں اتنی بڑھا دیں کہ مرزا صاحب ملازمت کے لئے تیار ہو گئے ۔ مگر ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ مالی پریشانی اور خود داری کی ٹکر میں کس کی جیت ہوتی ہے ۔

۱۸۴۲ء ہے ۔ مرزا غالب کو دلی میں رہتے ہوئے پورے تیس برس ہو چکے ہیں ۔ مرزا صاحب کے دیوان خانے میں صدرالصدور مفتی صدرالدین خاں آزردہ تشریف فرما ہیں ۔

منشی صاحب: مرزا صاحب کل مسٹر ٹامسن دلی کالج کے معائنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔

غالب :۔ وہ کیسا رہا۔

منشی صاحب: بہت اچھا رہا۔ ٹامسن صاحب مولوی مملوک علی نانوتوی ....

غالب : وہی جو عربی کے میر مدرس ہیں۔

منشی صاحب: جی ہاں وہی۔ مسٹر ٹامسن ان کے کام سے بہت خوش ہوئے اور خواہش ظاہر کی کہ فارسی کے لئے بھی ایک فاضل مدرس کا انتظام کیا جائے۔

غالب : پھر آپ نے کیا فرمایا۔

منشی صاحب: میں نے کہا اس وقت دلی میں تین صاحب فارسی کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔ ایک آپ کا نام لیا دوسرا الحکیم مومن خاں مومنؔ کا اور تیسرا الشیخ امام بخش صہبائی کا۔

غالب :۔ ٹامسن صاحب کیا بولے؟

منشی صاحب :۔ انھوں نے آپ کو آج گیارہ بجے اپنے بنگلے پر یاد فرمایا ہے۔

غالب : (گھبرا کر) بھئی یہ کیا غضب کیا۔ آتے ہی کیوں نہ کہا اب گیارہ بجا چاہتے ہیں۔ مجھے نوکری منظور ہو یا نامنظور مگر شرافت کا تقاضہ ہے کہ ٹھیک گیارہ بجے پہنچوں۔ یہ انگریز لوگ سنا ہے وقت کے بہت پابند ہوتے ہیں۔ (سوچ کر) اور ہاں اگر انھوں نے کہا کہ فارسی کی میر مدرسی قبول کیجئے۔

منشی صاحب :۔ تو جناب آپ ہاں کہہ دیجئے گا۔ آخر فارسی کی میر مدرسی ہے اور وہ بھی دلی کالج میں۔ عزت کی جگہ ہے۔

غالب : اچھا دیکھو چلتا ہوں۔ (کلو داروغہ کو آواز دیتے ہوئے) میاں کلو

کلو داروغہ : جی کیا حکم ہے۔

غالب : میاں کلو۔ کلیان سے کہنا پالکی لگوائے۔

مفتی صاحب : اچھا مرزا صاحب میں چلتا ہوں۔ دیکھئے معاملے کو بگاڑ نہ دیجیے گا۔

غالب : یہ بھی ایک ہی رہی۔ بھلا خواہ مخواہ میں کیوں بگاڑوں گا۔ دیکھتا ہوں صاحب کیا کہتے ہیں۔

کلو داروغہ : سرکار پالکی حاضر ہے۔

مفتی صاحب : اچھا مرزا صاحب۔ آداب عرض۔

غالب : آداب عرض مفتی صاحب۔

کہار : کہاں جانا ہے سرکار۔

غالب : ٹامسن صاحب کے بنگلے پر۔

کہار : بہت اچھا سرکار۔

(کہاروں کے ہانپتے کانپتے پالکی لے کر چلنے کی آواز)

غالب : بس بس یہاں روکو۔ یہی تو بنگلہ ہے نا۔

ایک کہار : (ہانپتے ہوئے) نہیں سرکار۔ یہ بنگلہ تو اجوٹن صاحب (Adjutant) کا ہے۔ ٹامسن صاحب کا بنگلہ تو آگے ہے۔

(کہاروں کے ہانپتے کانپنے کی آواز جاری ہے)

لیجئے سرکار یہ ہے بنگلہ۔

غالب : اچھا پالکی رکھ دو۔ صاحب کو اندر خبر کر دو۔

ایک کہار : بہت اچھا سرکار (اس کے چلنے کی آواز)

غالب : (کچھ دیر انتظار کے بعد) ابھی تک صاحب نہیں آئے۔

ایک کہار : حضور صاحب تو نہیں آئے۔ یہ جمعدار صاحب آئے ہیں۔

جمعدار : حضرت تشریف لے چلئے، ٹامسن صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

غالب : ٹامسن صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں، یہ بھی ایک ہی رہی۔ ارے صاحب کوئی پذیرائی کو۔ آئے تو اُتروں۔

جمعدار : حضرت ذرا آہستہ آہستہ فرمائیے۔ صاحب نہ سُن لیں۔ آپ رسمی ملاقات کے لئے نہیں، ملازمت کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اس لئے ......

غالب : خوب۔ ملازمت اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے میرے عز و وقار میں اضافہ ہو نہ کہ جو رہا سہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔ نہ صاحب۔ ایسی ملازمت کو میرا دور سے سلام۔ (چیں بہ جبیں ہو کر کہاروں سے) دیکھتے کیا ہو پالکی اٹھاؤ۔

(کہاروں کے ہانپنے کانپنے اور پالکی لے کر چلنے کی آواز)

راوی : لیجئے صاحب خودداری کی جیت ہوئی۔ ملازمت قربان۔ مالی مشکلیں اپنی جگہ اور یہ رکھ رکھاؤ اپنی جگہ۔ انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے۔ دوست تھے۔ درباروں میں شرکت کرتے تھے۔ قصیدے پڑھتے تھے۔ خلعت پاتے تھے۔ تسلیم۔ مگر اس کے باوجود صوبے کے سب سے اعلیٰ حاکم سے ملاقات اور کالج کی ملازمت سے انکار۔ یہ استغنا مرزا صاحب کی خودداری کا ثبوت ہے۔ ٥

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

وقفہ

راوی : ۱۸۴۹ء کا غدر ابھی آٹھ برس دور ہے۔ دلی میں امن چین ہے۔ ادب ترقی پر ہے اور ادیبوں کی محفلوں سے دلی ایک مسلسل محفل مشاعرہ۔ مرزا صاحب۔ مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے کی حویلی میں رہتے ہیں۔ صحن میں مرزا صاحب۔ نواب شیفتہ۔ نواب ضیاء الدین خاں، حکیم احسن اللہ خاں، مولانا نصیر الدین تشریف فرما ہیں۔

مولانا نصیر الدین : حکیم مومن خاں مومن کے انتقال کا بڑا قلق ہے۔

حکیم احسن اللہ خاں : ہاں صاحب کیا آن بان کا آدمی تھا۔ اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔

شیفتہ : صاحب۔ غزل میں ایک نئے اسلوب کے موجد تھے۔ ان کا کیا خوب شعر ہے۔ ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب : خوب شعر ہے۔ جب تک کسی شخص نے واقعی عشق نہ کیا ہو اور کسی کے فراق کا مزہ نہ چکھا ہو اسے یہ مضمون سوجھ ہی نہیں سکتا اور آج کل ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

مومن اہلِ دل اور اہلِ نظر تھا۔ مومن کے مرجانے سے زندگی کا لطف آدھا رہ گیا۔ اور میرے بعد!

شیفتہ : مرزا صاحب۔ اب گفتگو نے یہ رنگ اختیار کیا ہے تو ظلم ہوگا اگر آپ

اپنی یہ غزل پوری نہ سنائیں۔

غالب : دل کی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے کہ میں خود ان اشعار کو دہرانا چاہتا ہوں۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

سب : (متاثر ہو کر) واہ واہ۔ ماشاء اللہ کیا سحر بیانی ہے۔

غالب : (ایک خاص کیفیت میں گویا صرف اپنے آپ ہی کو سنا رہے ہوں)

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا

ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس سے بھی دھواں اٹھتا ہے

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی

کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

تنے بے بکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ !

کس کے گھر جائے گا سیلابِ وفا میرے بعد

راوی :۔ مگر سیلاب بلا نے غالب کے بعد کا انتظار نہیں کیا اور آٹھ ایک برس پہلے بہت بعد کسی ایک کے گھر پر نہیں بلکہ ساری دلی پر ٹوٹ پڑا۔ بادشاہ کی بادشاہ گئی۔ امیروں کی امیری خاک میں ملی۔ دلی لٹی۔ اس کی اینٹ سے اینٹ

بھی۔ جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثار و ہستی سراسر لٹ گئے۔

غالب ــ یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط

دامان باغبان و کف گل فروش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ

یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں

نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

راوی: مگر اس شمع نے رنج و اندوہ کی آندھیوں میں بجھنا نہیں سیکھا تھا خود بھی روشن رہی اور اپنے گرد مایوسی کا اندھیرا نہ ہونے دیا۔ ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت چند گورے کوچہ بندی کی دیواریں پھاند کر بلی ماروں کے محلے میں گھس آئے۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے انکو روکنے کی کوشش کی لیکن ان ایک نہ چلی۔ گوروں نے لوگوں کے مال و اسباب کو تو ہاتھ نہ لگایا لیکن مرزا صاحب اور ان کے ہمسایوں میں سے چند آدمیوں کو پکڑ کر لے گئے اور کرنل براؤن کے سامنے پیش کر دیا۔

براؤن: (ایک ہمسائے سے) ول تم کون۔

ہمسایہ : صاحب ہم مسلمان ۔

براؤن : (دوسرے ہمسائے سے) ول ٹم کون ۔

دوسرا ہمسایہ : جی میں بھی مسلمان ۔

براؤن : (غالب سے) اور تمہارا نام ۔

غالب : خاکسار کو غالب کہتے ہیں ۔

براؤن : ول ٹم بھی مسلمان ۔

غالب : (نہایت لجاجت سے) حضور یہ خاکسار بھی مسلمان مگر آدھا ۔

براؤن : ول یہ آدھا مسلمان کیسا ۔ مسخری نہیں مانگتا ۔

غالب : (متانت سے) جی نہیں ۔ مذاق کرنے کی نہ جرات نہ موقع ۔ چونکہ شراب پیتا ہوں اور سور نہیں کھاتا ۔ اس لئے اپنے کو ان دوسروں کے مقابلے میں آدھا مسلمان کہا ۔

(سب ہنس پڑتے ہیں جس میں کرنیل براؤن کی موٹی موٹی ہنسی ہا ۔ ہا ۔ ہا الگ سنائی دیتی ہے)

وقفہ

راوی : رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت : اور بھی بلائیں آئیں اور گذر گئیں سال گذرتے گئے اور مرزا صاحب کچھ عمر کی وجہ سے کچھ بیماریوں کی وجہ سے کمزور اور بوڑھے ہوتے گئے ۔ نہ آزاد تھے نہ مقید ۔ نہ رنجور نہ تندرست ۔ نہ خوش تھے نہ ناخوش ۔

غالب : رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

راوی : یہ مشکلیں انھوں نے اپنے اوپر کس طرح آسان کیں یہ بھی ایک معجزہ ہے ۔
یقین نہ آئے تو ان کے ساتھ ذرا زنانخانے میں چلئے ۔

غالب : (آہستہ آہستہ لکڑی ٹیکتے ہوئے بوڑھی کمزور آواز میں) میاں نیاز ۔ اے
میاں نیاز بیگم صاحبہ کہاں ہیں (باقر علی خاں کی بیوی بگا بیگم کو آتے ہوئے
دیکھ کر) او ہو یہ تو بگا بیگم آ رہی ہیں ۔ کیوں بی دلہن ۔ ہماری بیگم موسیٰ کی
بہن کہاں ہیں ۔

بگا بیگم : (کم عمر ہیں) جی ابھی آتی ہیں ۔ نماز پڑھ رہی ہیں ۔

غالب : خوب ۔ بیگم نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا دیا ۔

امراؤ بیگم : (ان کی بوڑھی بیوی) (ذرا زور سے بولتے ہوئے) ۔ میں آ رہی ہوں ۔ اگر
خود نماز نہیں پڑھتے تو کم سے کم بہو کے سامنے نماز کا مذاق تو نہ اڑاؤ
(قریب آتے ہوئے) جی فرمایئے ۔ ارشاد ۔

غالب : کچھ نہیں ۔ یہی کہتا تھا کہ ایک بیوی دو میں تیسری آنکھوں میں ٹھیکرا ہو
میں اور تم تو بیٹھے ہیں یہ کیوں بیٹھی ہیں ۔

امراؤ بیگم ۔ اے توبہ ۔ ان کو تو ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہئے ۔ اب بھول گئی ۔ دلہن تم کہاں
چلیں ۔ ان کی بات کا کیا برا ماننا ۔ ادھر کوٹھری کی طرف نہ جانا ۔ برسات
ہے ۔ کیڑے پتنگے کا ڈر ہے ۔

غالب : دلہن بھئی ہمیں کیا خبر تھی ۔ ہماری بات کا اتنا برا مناؤ گی ۔ لو ادھر آؤ
اور کھانا بھی منگوا لو ۔

بگا بیگم ۔ جی نہیں میں تو برا نہیں مانتی اور کھانے کے لئے تو میں نے پہلے ہی دوا سے

کہہ دیا تھا وہ لارہی ہیں یہ لیجئے دستر خوان بچھ گیا۔

غالب : ہیں یہ کیا۔ یہ آج سالن میں چنے کی دال نہیں پڑی۔ بھئی اگر دال گھر میں ختم ہو گئی تھی تو خود کسی کو بھیج کر منگوائی ہوتی یا مجھ سے کہا ہوتا میں منگوا دیتا۔

امراؤ بیگم : جی نہیں دال تو گھر میں موجود ہے۔ بہو چنے کی دال نہیں کھاتیں اس لئے سالن میں نہیں ڈالی گئی۔

غالب : خوب۔ یہ تو خدا سے بھی بڑھ گئیں۔ توبہ۔ توبہ۔ میں تمہیں بتاؤں۔

امراؤ بیگم : جی معاف کیجئے۔ میں نہیں سنتی۔ بہو کو سناؤ۔

غالب : نہیں سنتی نہ سنو۔ ہم بہو کو سناتے ہیں۔ دیکھو بہو۔

بگا بیگم : جی

امراؤ بیگم : بیٹی تو ان کی باتوں پر دھیان نہ دے۔

غالب : بس یہی شاید حسین علی کو بھی سکھاتی ہوں گی کہ وہ ننگے پاؤں لے کر میرے پلنگ کی چادر پر گل کاری کرے اور میری نہ سنے لو وہ چلا آرہا ہے۔ (آواز دیتے ہوئے) حسین علی۔

حسین علی : (جو ابھی بچہ ہے) جی دادا۔

غالب : کیوں حضت پڑھ کر آئے ہو۔

حسین علی : جی ہاں پڑھ کر آیا ہوں۔ ایک کام تھا۔

غالب : (ہوں) پڑھ کر آیا ہوں۔ میں پڑھنے کے لئے کہتا ہوں تو کبھی ادھر دبک جاتا ہے کبھی ادھر خضر مرزا اور دوسرے لمڈوں کے ساتھ بھاگا پھرتا ہے پڑھ کر آیا ہے اور یہ کام کیا تھا؟

حسین علی : محلے میں کٹھ پتلیوں کا تماشا ہوا تھا نا۔

غالب : ہوا تھا پھر؟

حسین علی : اور کسی نے روپے نہیں دیئے۔

غالب : اچھا ہوا مفت میں تماشا دیکھا۔

حسین علی : جی نہیں۔ مفت میں نہیں۔ چونکہ کٹھ پتلی والے کو بلا کر میں لایا تھا وہ مجھ سے ہی مانگ رہا ہے۔

غالب : ہاں کیوں نہ ہو۔ تیرے دادا کے گھر پر تو بڑے ہاتھی بندھے ہیں نا اور روپے دینے کیسے نا ہیں۔

حسین علی : صرف پانچ۔

غالب : (بیوی سے) بیگم سنا آپ نے۔ صرف پانچ روپے۔ یہاں شراب بھی قرض منگا کر پیتے ہیں۔ اور صاحبزادے فرماتے ہیں صرف پانچ۔ مگر اس وقت تو حسین علی کو پانچ روپے دے ہی دو۔ پیارا بیٹا ہے نا۔

وقفہ

راوی : تنگی ترشی، قرض خواہوں کے تقاضے، وظیفے کی فکر، سب ان کے اپنے لئے تھا۔ ان کی زندگی کی اقتصادی مہم اس طرح ناکام رہی کہ تھوڑے دل والا انسان بددل اور مایوس ہو جاتا۔

غالب : سہ دھکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ، طلب گار مرد تھا

راوی : پھر غالب کی ہمت ہی تھی کہ انھوں نے غم والم اور مایوسی اور ناکامی کے

عالم میں بھی اپنی شوخ طبعی اور شگفتگی برقرار رکھی۔

مرنے سے ڈیڑھ دو برس پہلے خواجہ عزیز الدین لکھنوی ملنے آئے۔ اس زمانے میں مرزا صاحب دن دن بھر لیٹے رہتے تھے۔ کوئی تکلف کا ملنے والا آگیا تو اُٹھ کر بیٹھ جاتے خوراک نہ ہونے کے برابر تھی۔ عزیز صاحب جب پہنچے ہیں تو لیٹے ہوئے دیوان قاآنی سینے پر رکھے آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ ان کے سلام کا جواب نہ دیا۔ کیونکہ بہرے ہو چکے تھے۔ عزیز صاحب نے الٹے قدم لوٹ جانے کا ارادہ کیا کہ مرزا صاحب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے کروٹ بدلی اور انہیں دیکھا۔

غالب۔ آیئے آیئے تشریف لایئے۔ معاف کیجئے میں نے دیکھا نہ تھا۔ ممکن ہے آپ نے آواز دی ہو مگر میں کانوں سے بالکل نہیں سن سکتا۔ آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا ہے۔ ٹھہرئیے میں نیچے اترتا ہوں۔

عزیز: جی نہیں۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ میں تو کھڑے کھڑے ملنے آیا تھا۔

غالب: (جنھوں نے بالکل سنا ہی نہیں) ادھر چارپائی سے بھی اترنا کتنا مشکل ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

بھئی یہ قلم دان ہے یہ کاغذ۔ مجھ سے بات کرنے کے لئے آپ کو اس پہ لکھنا پڑے گا۔

عزیز۔ (کاغذ پر لکھتے ہوئے۔ ساتھ کے ساتھ عادت سے مجبوراً اسے پڑھتے ہوئے) اچھا لائیے لکھوں آپ اتنے مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ انشاء اللہ صحت ہو جائے گی۔

غالب: نہیں عزیزم۔ اب میں جینا نہیں چاہتا۔ بہت جیا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ایک ایک کر کے سب احباب رخصت ہوئے۔ اب میں بھی پابہ رکاب ہوں۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

وقفہ ۱۸

راوی: اور ۱۴ ؍ فروری ۱۸۶۹ء کو وہ سحر بھی آن پہنچی جس کے انتظار سے بے چین ہو کر پوچھ بیٹھے تھے ۔ ع

غالب:- اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔

راوی: اور اکثر دہراتے تھے۔

غالب: ؎ دم واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہی ہے

راوی: پچھلے چند دنوں سے متواتر غشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ اس ہی وجہ سے حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں برابر موجود ہیں ۔ آج ذرا افاقہ ہوا ہے۔

غالب: (بہت نحیف آواز میں) کلو میاں کلو بیگم سے کہنا کھانے کو جی چاہتا ہے ۔ یوں ہی کچھ ذرا سا کھانا بھجوا دیں۔ مگر دیکھو مرزا جیون بیگ کو بلا لاؤ ۔ اس کو بھی ساتھ کھلائیں گے۔ کئی دنوں سے بچی آئی نہیں ہے۔

کلو: بہت اچھا سرکار (محل سرا کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے) وفادار۔ وفادار۔ سرکار چھوٹی صاحبزادی کو یاد فرماتے ہیں اور کھانا بھی بھجوا دو۔

وفادار:- چھوٹی صاحبزادی آرام فرما رہی ہیں ۔ بیگم صاحبہ فرماتی ہیں جو نہی جاگتی ہے۔ بھیج دوں گی۔

کلو: اچھا دیکھو جاگتے ہی بھیج دینا۔ سرکار یاد فرما رہے ہیں (وقفہ کے بعد حکیم محمود خاں سے) حکیم صاحب آپ لکھ کر بتا دیجئے کہ چھوٹی صاحبزادی سو رہی ہیں ۔ جاگتے ہی آجائیں گی۔

حکیم صاحب :۔ لاؤ لکھ دوں۔ لو یہ مرزا صاحب کو دکھا دو۔

غالب : اچھا سو رہی ہے۔ بھی جب وہ آئیگی تب ہم کھانا ....

کلو : حکیم صاحب، حکیم صاحب سرکار بے ہوش ہو گئے۔ سرکار بے ہوش ہو گئے۔

حکیم صاحب : دماغ پر فالج گرا ہے۔ اللہ ہی مالک ہے۔

راوی : تمام کوششیں کی گئیں۔ علاج بھی ہوئے مگر بے سود۔ انہیں ہوش نہ آیا۔ اس ہی حالت میں اگلے دن دوپہر ڈھلے یہ باکمال شاعر خدا کو پیارا ہوا۔ اور نظام الدین میں دفن ہوا۔

قید حیات و بند غم دونوں اصل میں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کا لطیفہ

چندو لال کے بارے میں

غالب نے تنگدستی کے عالم میں ناسخ کو لکھا تھا کہ لکھنو سے مدد کروائیں۔

ناسخ نے حیدرآباد کے دیوان مہاراجہ چندو لال سے رجوع کرنیکا مشورہ دیا تھا کیونکہ وہ شعرا کے قدردان تھے، شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اس کے جواب میں غالب نے کہا تھا۔"

"چندو لال زمزمہ مہاراجہ داند و ہنجار مہاراگی در یابد۔ آنکہ در پارسی قتیل را بادستادی گیرد، غالب را چہ می کند و آنکہ در اردو نصیر را ستاید ناسخ را چہ می کند۔ و خود عمرش از بستادو ستجاوز است۔ "تا باو میرسم او بہ جہنم میرسد"

(متفرقات غالب)

عبد القادر سروری

غالب اور کشمیر

(غالب کی والدہ کشمیری تھیں!)

غالب کا ذاتی اور طبعی ربط کشمیر کے ساتھ نہیں رہا۔ اس طرح جس طرح مولانا شبلی کا رہا تھا۔ لیکن واقعاتی شہادتیں کچھ ایسے قرائن مہیا کرتی ہیں کہ ان کی رگوں میں کشمیری خون تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم جن کے پاس اپنی خاندانی روایات محفوظ تھیں، ان کے بیانات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ غالب کی ننہال کا تعلق کشمیر سے گہرا تھا۔ ان شہادتوں کی چھان بین کے بعد، ڈاکٹر یوسف حسین خان بھی، اپنی حالیہ تصنیف "غالب اور آہنگ غالب" میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:۔

"غالب کے نسب کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ خالص ترک یا مغل نہیں تھے اس کا قوی امکان ہے کہ ان کے باپ دادا کی طرف سے ان کی رگوں میں افغانی خون تھا اور ننہال کی طرف سے کشمیری خون ہو"

غالب کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کے بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:۔

"خواجہ غلام حسین خاں کے بارے میں ہماری معلومات چونکہ محدود ہیں اس لئے

فی الحال مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاندانی روایات پر اعتماد کیا
جاسکتا ہے کہ وہ کشمیری تھے ۔"

اس اعتبار سے غالب کی والدہ کے بارے میں یہ واضح طور پہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ کشمیری تھیں ۔ چنانچہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو جانچنے کے بعد ڈاکٹر یوسف حسین خاں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ :۔

"مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے بزرگوں سے جو سنا تھا، اسے
تسلیم کرنا چاہیے کہ غالب کی والدہ کشمیری تھیں ۔"

اس تحقیق کی مزید تائید ان حالات سے بھی ہوتی ہے کہ غالب ہی کے قول کے مطابق، ان کا بچپن آگرہ میں کشمیرن کے کٹرہ میں گذرا تھا، اس کے علاوہ ان کے نانا کے نام کے ساتھ "خواجہ" کا احترامی لقب ان کے کشمیری ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ کشمیر کے معزز خاندانوں میں یہ لقب عام ہے ۔

غالب نے خود اس بارے میں کہیں تفصیل نہیں لکھی ۔ یہ نتائج واقعاتی شہادتوں کی کڑیوں کو جوڑ کر اخذ کئے جاسکتے ہیں ۔ غالب کی شاعری میں بھی کشمیر کے بارے میں کوئی مربوط نظم اس طرح کی نہیں ملتی ۔ جیسی بعض فارسی شعراء نے لکھی ہیں ۔ ان کی اردو اور فارسی شاعری میں کہیں کوئی شعر کشمیر کے بارے میں ملتا ہے، تو وہ زیادہ تر فارسی شعرا کے کلام سے کشمیر کے حسن اور مناظر کی خوبی کے بارے میں اخذ کئے ہوئے تاثرات کا ردعمل ہے ۔ اس اعتبار سے غالب کی شاعری کا رویہ خاص ہے ۔ وہ تاج محل کی سرزمین میں پیدا ہوئے اور ان کے عنفوان کا زمانہ وہیں گذرا اس کا بھی یقین ہے کہ انھوں نے تاج محل کو دیکھا ہوگا ۔

لیکن، تاج محل کی تعریف میں انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اس میں کچھ تو اس روایت کو دخل ہے کہ سوائے نظیر اکبرآبادی کے' اردو غزل کے قابل ذکر اساتذہ میں تاج محل کی تعریف میں شاید ہی کسی نے کچھ لکھا ہو۔ غالب کا ذہن اپنے عہد کی جدیدیت کا پرتو لئے ہوئے بھی کلاسیکی معیاروں سے تجاوز کرنا پسند نہیں کرتا۔

کشمیر سے غالب کے ذہنی تاثر کے جو نمونے ملتے ہیں، ان میں ایک فارسی غزل کا مطلع ہے، جس میں انھوں نے بت کشمیر کے حسن کو سراہا ہے۔ شعر ہے:

حور بہشتی زیاد آن بت کشمیر برد　　　ہم صراط از نہاد آن دم شمشیر برد

ایک شعر اردو میں بھی مل جاتا ہے، لیکن یہ شعر ان کے منتخب دیوان میں شامل نہیں ہے، بلکہ صرف بعض نسخوں میں درج ہے۔ اوپر کے شعر میں جہاں انھوں نے کشمیر کے انسانی حُسن کی توصیف کی ہے، اردو شعر میں کشمیر کے مناظر کی خوبی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ شعر دراصل میر کی شاعری اور ان کے دیوان کی توصیف میں ہے:۔

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب　　　جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

کشمیر کے بارے میں غالب کے "تاثرات اور ان کے اظہار سے ہٹ کر جہاں تک ان کے کلام تعلق ہے' ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ جموں و کشمیر میں اس زمانے سے مقبول رہا ہے' جب اس کو قرار واقعی شہرت حاصل ہونے لگی۔ یہ موجودہ صدی کے اوائل کا زمانہ تھا' جب اہل وجموں و کشمیر ان کے کلام سے متعارف ہوئے۔ اس کا ذریعہ وہ کشمیری گانے والے تھے' جو اپنے فن کی نمایش کرتے' ہندوستان کے شہروں میں گھومتے تھے۔ اس وقت تک غالب کی غزل ہندوستان بھر میں

شہرت حاصل کر چکی تھی۔ کشمیری گوئے اپنے ساتھ یہ ذوق لے کر وطن لوٹتے تھے۔
چنانچہ انھیں کی بدولت غالب کی کچھ غزلیں جموں اور کشمیر کے پڑھے لکھے لوگوں
سے متعارف ہوئیں۔ یہ جلد مقبول بھی ہو گئیں اور محفلوں میں گائی جانے لگی تھیں

کشمیر میں خاص طور پر غالب کی غزلوں کی مقبولیت کا ایک اور سبب بھی تھا۔
ہندوستان کے رئیس، امیر اور راجے مہاراجے اور عہدہ دار، جن میں غالب کی
شاعری کا ذوق عام ہو چکا تھا، جب کشمیر کی سیاحت کو آتے تو ان کی دلچسپی کے
لئے محفلیں منعقد ہوتیں، جن میں کشمیر کے گانے والوں سے غالب کی غزلیں سنانے
کی فرمایش کی جاتی۔ اس لئے ہر گوئے کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ غالب کی
چند مقبول غزلیں یاد رکھے۔ یہ غزلیں اہل کشمیر کی محفلوں میں بھی سنائی جاتی تھیں۔

جموں اور کشمیر کے اہل علم بھی اکثر ہندوستان جاتے آتے رہتے تھے۔
اپنے قیام ہندوستان میں ان کو بھی غالب کے کلام سے ربط پیدا ہو جاتا تھا،
اور یہ ربط وطن لوٹنے کے بعد بھی برقرار رہتا۔ لیکن جیسے جیسے ہندوستان
سے کشمیر کے روابط بڑھتے گئے اور یہاں تعلیم عام ہوتی گئی، تعلیم یافتہ
کشمیریوں کے لئے غالب ان کے اپنے شاعر بن گئے۔ چند مثالیں ذیل میں
درج کی جاتی ہیں:

پنڈت تیج ناتھ تکو جو ناز تخلص کرتے تھے تعلیم سے فارغ ہونے کے
بعد ریاست منڈی میں ملازم رہے۔ وہ مہاراجہ منڈی کے ایڈیکانگ بھی
ہو گئے تھے۔ بعد میں منڈی کی ملازمت ترک کر کے کشمیر آئے اور افسر حسابات
کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ناز کو بچپن سے شعر و سخن کا شوق تھا اور ان کے

والد پنڈت برج موہن لعل تکو جو فارسی میں شعر کہتے تھے، زیبا تخلص کرتے تھے۔ ایک دفعہ باپ اور بیٹے میں غالب کا کلام موضوعِ بحث تھا، اور غالب کی مقبول غزل کے مصرعہ۔ "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے" پر طبع آزمائی کا خیال پیدا ہوا۔ تانے نے فوراً ذیل کا شعر اسی زمین میں سنایا:

تم اگر بام پہ آجاؤ تو جھگڑا مٹ جائے　　دیکھیں تم اچھے ہو یا ماہِ کمال اچھا ہے

غالب ہی کے زمانے میں کشمیر میں دو بھائی تھے۔ پنڈت ہرگوپال کول اور پنڈت سانگرام کول دونوں ہی فارسی اور اردو ادب کا گہرا شغف رکھتے تھے۔ سانگرام سالک تخلص کرتے تھے، اور بہت سا کلام، ایک مثنوی "سحرالبیان" کے جواب میں اور ایک داستان رجب علی بیگ کے "فسانہ عجائب" کے نمونے پر بھی تھی۔ اردو میں ایک دیوان بھی چھوڑا اور کئی قانونی کتابوں کے بھی مصنف ہوئے۔ بڑے بھائی پنڈت ہرگوپال بھی مصنف اور شاعر تھے۔ کشمیر کی تاریخ پر ان کی "گلدستۂ کشمیر" مشہور ہے۔ وہ غالب کے کلام سے روشناس تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے ایک شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ ہیں چنانچہ انھوں نے تفتہ کے اتباع میں اپنا تخلص خستہ اختیار کیا تھا۔ نام کی مناسبت کے علاوہ تفتہ اور خستہ میں قافیہ کا جو تلازم ہے، وہ بھی دلچسپ ہے۔ میں نے ان دونوں بھائیوں کے حالات اور تصانیف پر ایک کتاب "کشمیر کے دو بھائی ـــ دو ادیب" کے عنوان سے شائع کی ہے۔

کشمیری پنڈتوں میں ایک اور صاحبِ ذوق شاعر پران کشور بھی ہوئے ہیں، جو پران تخلص کرتے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے عاشق تخلص اختیار کیا تھا،

لیکن بعد میں یہ تخلص ترک کرکے پرآن اختیار کیا۔ غالب کے کلام سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ اسی لئے "فیض غالب" کے عنوان سے ایک طویل قصیدہ تصنیف کیا تھا۔ "بہار گلشن کشمیر" کے مولفین نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ پرآن نے غالب کی فارسی اشعار کا منظوم ترجمہ کیا تھا جو حسب ذیل ہے:

بہ آدم زدند بہ شیطاں طوق لعنت	سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم	گراں تر آمد از طوق عزازیل

پرآن کشور کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

آدم کو تو عورت ملی شیطان کو لعنت	دو طوق پڑے دونوں کی گردن میں آ کر
تکریم کا تذلیل کا تھا فرق جہان میں	ہے کفش وہی کفش دو شانے کے بھی اندر
پھر طوق کو دھر تولا تو یہ بے ہی کھا	تھا طوق سے ابلیس کے آدم کا گراں تر

کوئی پانچ برس ہوئے، شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی کے اہتمام سے یوم غالب منایا گیا تھا۔ جس میں یونیورسٹی کے علاوہ انجینئرنگ کالج اور گورنمنٹ ویمنز کالج، سرینگر نے حصہ لیا۔ یونیورسٹی میں سمپوزیم منعقد ہوا تھا جس کی صدارت، انجینئرنگ کالج کے پرنسپل، پروفیسر مونس رضا نے کی اور شعبہ اردو و فارسی کے اساتذہ نے مقالے پڑھے۔ اسی روز ویمنز کالج سری نگر کی طالبات نے مس محمودہ احمد علی شاہ پرنسپل کالج کی سرپرستی اور مس بلقیس فاطمہ استاد اردو کی زیر ہدایت ڈراما "دیوانہ غالب" پیش کیا تھا۔ ڈراما میں مہمان خصوصی جناب خواجہ غلام محمد صادق چیف منسٹر تھے۔ دیوانہ غالب کی اداکار مس زبیدہ استاد شعبہ تعلیم تھیں۔ ڈراما دیکھنے کے لئے یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ

اور پرنسپل صاحبان تشریف لائے تھے۔

پچھلے سال صدسالہ جشنِ غالب کے سلسلے میں، یونیورسٹی اور مختلف کالجوں تقریبات وسیع پیمانے پر منائی گئیں اور ان تقریبوں کا سلسلہ پورے سال پہ حاوی رہا۔ طلبا اور طالبات کی جس وسیع تعداد نے مختلف تقریبوں میں حصہ لیا اور کوئز کے مقابلوں میں غالب کی زندگی اور کلام سے واقفیت کا جو ثبوت دیا، اس سے غالب کی شاعری کی وسیع اپیل کا اندازہ ہوتا تھا۔ بیت بازی جس میں غالب کی اردو غزلوں کے شعر سنائے گئے، دو ڈھائی گھنٹوں تک جاری رہی اس کے باوجود طلبہ اور طالبات کا اشعار پیش کرنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ محفلِ شعر میں طلبہ اور طالبات نے غالب کی غزلوں کی زمینوں میں کہی ہوئی اچھی اچھی غزلیں سنائیں۔ غالب کی حیات اور ان کی تحریروں کی نمائش کو، جسے جناب پرتھوی چندر نے منظم کیا تھا۔ طلبہ اور طالبات نے بڑے ذوق اور شوق سے دیکھا۔ نمائش کے افتتاح کی رسم جناب خواجہ غلام محمد صادق صاحب نے انجام دی تھی اور اس موقع پر انھوں نے غالب کی فکر اور فن کو جس طرح سے خراج عقیدت پیش کیا تھا، اس سے غالب کی شاعری اور اس کے رجحانات کی گہری جانکاری کا اندازہ ہوتا تھا۔

ملک نصراللہ خاں عزیز، مشہور صحافی ۱۹۲۳ء میں کشمیر کی سیر کو آئے تھے وہ انجمن مفرح القلوب کی محفلوں میں شریک ہوئے تھے، اراکینِ انجمن کے غالب کے کلام کے ذوق کا تذکرہ خاص طور پر کرتے ہیں۔

صد سالہ جشن غالب

(جموں و کشمیر میں)

غالب کی صد سالہ برسی جموں اور کشمیر میں وسیع پیمانے پر منائی گئی۔ اس سلسلے میں جناب علی سردار جعفری کے سرینگر میں قیام کے زمانے میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا تھا، جس میں ریاست میں صد سالہ جشن غالب منانے کے بارے میں غور کیا گیا اور تقریبوں کے سرانجام کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کے سرپرست ریاست کے گورنر، شری بھگوان سہائے منتخب ہوئے، صدر جناب خواجہ غلام محمد صادق صاحب چیف منسٹر ریاست اور نائب صدر وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر، جموں و کشمیر یونیورسٹی اور مس محمودہ احمد علی شاہ، پرنسپل گورنمنٹ ویمنز کالج، جناب وزیر جا نکی ناتھ، چیف جسٹس اور پروفیسر جیالال کول منتخب ہوئے، معتمد عبدالقادر سروری کو منتخب کیا گیا۔ ایک وسیع مجلس مشاورت بھی قائم کی گئی جو کشمیر اور جموں کے علاوہ لداخ کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔

مجلس مشاورت کے متعدد جلسے منعقد ہوئے۔ اور ایک مجلس انتظامی بھی تشکیل دی گئی۔ یونیورسٹی کیمپس میں جشن کی تقریبات کا انتظام کرنے کے لئے یونیورسٹی اور ریجنل انجنیئرنگ کالج کے اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی،

جس کے سرپرست یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر اور صدر پروفیسر مونس رضا پرنسپل ریجنل انجینئرنگ کالج، سرینگر اور معتمد پروفیسر قاضی غلام محمد صاحب ریڈر شعبہ ریاضیات منتخب ہوئے۔

تقریبیں:۔ سرینگر کے کالجوں کے زیر اہتمام جشن کی متحدہ تقریبیں منانے کے لئے ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کی صدر مس محمودہ احمد علی شاہ پرنسپل، گورنمنٹ ویمنز کالج سرینگر اور اراکین کالجوں کے صدور تھے، اس کمیٹی کے معتمد عبدالقادر سروری مقرر ہوئے تھے۔

یونیورسٹی کیمپس کمیٹی کے زیر اہتمام مختلف کالجوں میں حسب ذیل تقریبیں منعقد کی گئیں:۔

۱۔ بیت بازی کا مقابلہ غالب کے اردو اشعار تک محدود تھا جس میں طلبا اور طالبات نے حصہ لیا۔ گورنمنٹ میڈیکل کالج، سرینگر میں منعقد ہوا۔

۲۔ کوئز کا مقابلہ (جس میں غالب سے متعلق سوالات کے فوری جوابات طلبا، اور طالبات نے دئے) گورنمنٹ امر سنگھ کالج، سرینگر میں منعقد ہوا۔

۳۔ خوش خوانی کا مقابلہ (یہ بھی غالب کی غزلوں تک محدود تھا)۔ گورنمنٹ ٹیچرز کالج، سرینگر میں منعقد ہوا۔

۴۔ شام موسیقی (طلبا اور طالبات نے سازوں کے ساتھ غالب کی غزلیں سنائیں) گورنمنٹ ویمنز کالج، نوا کدل، سرینگر میں منعقد ہوا۔

۵۔ محفل شعر (غالب کی زمینوں میں طلبا اور طالبات نے اپنی کہی ہوئی غزلیں سنائیں) گورنمنٹ ایس۔پی۔ کالج، سرینگر میں منعقد ہوا۔

۶۔ ڈراما (جناب ام۔ ام بیگ صاحب کا لکھا ہوا) گورنمنٹ ویمنز کالج، سری نگر کی طالبات نے تیار اور سٹیج پر پیش کیا۔

ان تقریبوں میں حصہ لینے والے طلبا اور طالبات کو جو اول اور دوم آئے تھے انعامات عطا کئے گئے۔

شام موسیقی میں کرنل بشیر حسین زیدی، خازن مرکزی جشن کمیٹی نئی دہلی اور مسز شمع زیدی نے بھی شرکت کی، مسز شگفتہ مفتی پرنسپل گورنمنٹ ویمنز کالج، نواکدل نے مہمانوں اور خاص طور پر کرنل زیدی اور شمع زیدی کا خیر مقدم کیا۔ محفل کے اختتام پر کرنل زیدی نے تقریر فرمائی جس میں غالب کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور تقریب کی کامیابی پر مبارکباد دی۔

یونیورسٹی کیمپس میں بھی حسب ذیل تقریبیں منعقد ہوئیں، جن میں طلبا اور طالبات نے حصہ لیا۔

۱۔ بیت بازی کا مقابلہ۔

۲۔ کوئز کا مقابلہ

۳۔ خوش خوانی کا مقابلہ

۴۔ محفل شعر۔ جس میں طلباء کے علاوہ اساتذہ نے بھی غالب کی زمینوں میں کہی ہوئی غزلیں سنائیں۔

۵۔ تصاویر کی نمائش۔ غالب کی زندگی اور ان کے اشعار کی تشریح سے متعلق طلبا کی بنائی ہوئی تصاویر کی نمائش منعقد کی گئی۔

تصاویر کو انعام دینے کا تصفیہ کرنے کے لئے مسز شمع زیدی اور ڈاکٹر

شکیل الرحمن ریڈر شعبہ اردو پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی تھی۔ کمیٹی نے شجاع سلطان متعلم ام۔ اے (پریوس) سیاسیات کو انعام کا مستحق قرار دیا۔

ان تقریبوں میں حصہ لینے والے طلبا اور طالبات کو جو اول اور دوم اور بعض صورتوں میں سوم قرار دئے گئے۔ انعام عطا کئے گئے۔

توسیعی تقاریر:۔ یونیورسٹی کے زیر اہتمام غالب کی زندگی اور ان کی فکر و فن پر توسیعی تقریروں کے لئے جناب مالک رام، مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر آل احمد سرور اور جناب ظ۔ انصاری کو مدعو کیا گیا تھا جناب مالک رام اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ تشریف نہ لاسکے اور مولانا عرشی کی علالت ان کی تشریف آوری کے مانع رہی۔ باقی تین علما کی تقریریں ہوئی، ان تقریروں کے موضوع حسب ذیل تھے:۔

۱۔ جناب ظ۔ انصاری (۱) غالب کا عہد۔
(۲) غالب کی فکر اور فن۔

۲۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (۱) غالب کی شاعری میں ایرانی ترکی عناصر
(۲) غالب خود اپنی تحریروں میں۔

۳۔ پروفیسر آل احمد سرور (۱) غالب کی شاعری کی عظمت۔
(۲) جدید شاعری۔

نمائش:۔ صد سالہ تقریبوں کے سلسلے میں جناب پرتھوی چندر صاحب مرتب "مرقع غالب" اور ان کے فرزند مسٹر ویدپرکاش نے غالب کی زندگی اور ان کی تحریروں کے عکس کی وسیع پیمانے پر نمائش کا اہتمام فرمایا تھا، جس کے

ساتھ غالب کے بارے میں لکھی ہوئی تصانیف کی بھی نمائش بھی منعقد کی گئی نمائش کا افتتاح عالی جناب خواجہ غلام محمد صادق چیف منسٹر نے فرمایا۔ آپ نے اپنی افتتاحی تقریر میں غالب کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے ان کے فکر و فن کے بعض نہایت اہم گوشوں پر روشنی ڈالی، اور ان کے عہد کے حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ غالب اردو کے شاعروں میں ایک ممتاز مقام اس لئے رکھتے ہیں کہ انہوں نے، اور سخن وروں کی طرح اپنے عہد کے ناسازگار حالات سے مغلوب ہو کر حقایق سے منہ نہیں موڑا اور راہ فرار اختیار نہیں کی یا تصوف اور اسی طرح کے سہارا دینے والے حالات میں پناہ نہیں ڈھونڈی، بلکہ انھوں نے حالات سے مقابلہ کیا۔ وہ نئے عصر کے تقاضوں کا پورا شعور رکھتے تھے، اسی لئے جو سرمایہ وہ چھوڑ گئے، وہ وقت اور زمانہ کی رعایتوں سے بلند ہے۔ اسی میں غالب کی حقیقی عظمت پوشیدہ

اس موقع پر جناب پرتھوی چندر صاحب نے جو تعارفی تقریر فرمائی تھی وہ اس شمارہ میں شامل ہے۔

جموں میں :۔ سری نگر میں غالب کی یوم وفات کی تاریخ ۱۵ فروری کو برف باری اور سردی کی شدت کی وجہ سے تقریبیں منعقد کرنے کے موا نہیں تھے۔ اس لئے اس کام کو جموں کی کمیٹی نے انجام دیا۔ جموں میں تقریبوں کے اہتمام کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس کے سرپرست بھی شری بھگوان سہائے، گورنر ریاست تھے۔ اور اس کے صدر ڈاکٹر گیان چند، صدر پوسٹ گراجویٹ شعبہ اردو، جموں ڈویژن جموں و کشمیر یونیورسٹی اور معتمد شری

مرت ملہوترا منتخب ہوئے تھے۔ تقریبوں کے سرانجام کے لئے صدسالہ جشن کی
حمایت سے ایک سو ارکان کی کمیٹی بنائی گئی تھی۔ کمیٹی نے غالب کے یوم وفات
۱۱ر فروری ۱۹۶۹ء کو جموں میں وسیع پیمانے پر ایک تقریب منعقد کی، جس کا
افتتاح شری بھگوان سہائے نے فرمایا اس کمیٹی کے زیر اہتمام محفل مشاعرہ
اور تقریبیں بھی منعقد کی گئیں۔

غالب پر تصانیف :۔ جشن کے اہتمام اور انتظامات کے لئے یونیورسٹی
نے تین ہزار روپیہ کا عطیہ مرحمت فرمایا تھا۔ جس میں سے دو ہزار روپیہ کشمیر
ڈیویژن کو دئے گئے اور ایک ہزار روپیہ جموں کے لئے ڈاکٹر گیان چند صدر
شعبہ اردو، جموں کی تحویل میں دئے گئے۔

کشمیر ڈیویژن نے یونیورسٹی کی عطا کردہ رقم سے یونیورسٹی کے اساتذہ
کی لکھی ہوئی غالب سے متعلق تصانیف کی اشاعت کا بھی پروگرام ترتیب دیا
ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی کتاب "غالب کے تخلیقی سرچشمے" جو ڈاکٹر حامدی
کشمیری نے تصنیف کی ہے، شائع کی جا چکی ہے۔

اس کتاب کی کے اجرائی رسم ۱۳ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو دن کے ڈیڑھ بجے
یونیورسٹی میں منعقد ہوئی، جناب خواجہ نورالدین وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی
نے صدارت فرمائی اور کتاب کی اجرائی کی رسم انجام دی۔ جلسہ میں مختلف
شعبوں کے اساتذہ اور طلباء نے شرکت کی۔ ابتدا میں جناب وائس چانسلر
صاحب نے جلسے کی غرض و غایت اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے
فرمایا کہ شعبہ اردو کے اس اقدام نے دوسرے شعبوں کو علمی اور ادبی کاموں

کے لئے مشعل دکھائی ہے۔ موصوف کتاب کے مصنف، ڈاکٹر حامدی سے اپنے
دیرینہ تعارف کی طرف اشارہ کیا اور ان کی ادبی صلاحیتوں کو سراہا۔ اس
کے بعد کتاب کے تعارف کی خواہش پر وفیسر عبدالقادر سروری، صدر شعبہ
اردو سے کی۔

پروفیسر سروری نے ہمارے قومی شاعر کی حیثیت سے غالب کی اہمیت
پر روشنی ڈالی اور ان کے فکر وفن کی عالمی قدروں کا تذکرہ کیا، جس کے
باعث ہندوستان سے باہر، یورپ اور امریکا کی کئی یونیورسٹیوں میں غالب
کی شاعری اور ان کی دوسری ادبی خدمات کا مطالعہ سنجیدگی سے ہو رہا ہے۔
کشمیر کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹی میں صد سالہ جشن کی تقریبیں جس وسیع
پیمانے پر منائی گئیں، ان کا بھی تذکرہ کیا اور یونیورسٹی کے عطیے سے صد سالہ یادگار
کے طور پر شعبہ کے اہتمام سے کتابوں کے ایک سلسلے کی اشاعت کی جو تجویز بنائی
گئی ہے، اس کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر حامدی کی تصنیف کے بارے میں انھوں نے بتایا
کہ ڈاکٹر حامدی نے اپنی تصنیف میں غالب کے فن کا تجزیہ نئے نقطہ نظر سے
پیش کیا ہے اور اس کے محرکات کی تلاش ان کے ماحول اور ان کی نفسی افتاد
میں کی ہے۔ غالب کی برسی کے سلسلے میں شائع ہونے والی تصانیف میں اس
کتاب کی اہمیت واضح کی۔ پھر ڈاکٹر حامدی سے، کتاب کے مشتملات پر روشنی
ڈالنے کی خواہش کی۔ ڈاکٹر حامدی نے مختصر طور پر کتاب کی تجویز اور اس کی
ترتیب کے بارے میں اپنے مخصوص نقطہ نظر کا تذکرہ کیا اور اس کی اشاعت کے لئے
پروفیسر سروری اور وائس چانسلر کی توجہ کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں جناب

وائس چانسلر نے کتاب کے اجرا کا اعلان فرمایا اور شعبہ اردو کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ پروفیسر سروری کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

تمت